فہمیدہ ریاض

کراچی

(ناول)

کراچی

(ناول)

فہمیدہ ریاض

تخلیقات

اکرم آرکیڈ، ۲۹۔ٹمپل روڈ (صفاں والا چوک) لاہور۔پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۴

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میرا وطن ملیر

وقت کے جادو گھر میں تحلیل ہوتی صدی کے آخری برسوں' اس برس کے آخری مہینے' اس مہینے کے آخری دنوں کی بات ہے۔

بحیرۂ عرب کے ساحل پر آباد' تیسری دنیا کے ایک غریب' بین الاقوامی مالی اداروں سے مستقل امداد خواہ ریاست کے ایک عظیم الجثہ شہر کے نو تعمیر اور شاندار ہوائی اڈے سے ایک جہاز علی الصبح منہ اندھیرے پرواز کرنے والا ہے۔

اس میں بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کس کر حفاظتی پیٹی باندھ رکھی ہے۔ اس کے بغیر' اسے یقین ہے کہ وہ اپنی سیٹ ہی سے نہیں بلکہ جہاز سے بھی نیچے گر پڑے گی اور شاید اس

گول کرۂ ارض سے پھسلتی ہوئی زمین' کی ٹکر پکڑنے میں ناکام' کہیں خلا میں گم ہو جائے گی۔

برطانیہ جانے والی اس پرواز میں' جو آدھے گھنٹے کے لیے دوبئی میں رکے گی' بہت کم مسافر ہیں۔ عورت اپنے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لے کر مہینہ بھر برطانیہ میں رہنے کی غرض سے جا رہی ہے۔ (چھٹی بڑھانے کی درخواست' بہ سبب علالت وہ برطانیہ سے بھجوا دے گی)

وطن چھوڑتے ہوئے وہ کافی خوش ہو رہی ہے۔ شہر میں کئی برس سے بدامنی پھیلی ہے۔ فائرنگ ہوتی ہے اور لوگ مارے جاتے ہیں۔ چوریاں' ڈاکے' اغوا' غرض تمام پر تشدد جرائم یا واقعات اکتا دینے والی یکسانیت سے مسلسل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی ان کی رفتار تیز اور کبھی سست ہو جاتی ہے۔ چند دنوں سے قتل کی وارداتوں میں تیزی آ گئی تھی۔ ہر روز اوسطاً سات آٹھ' سات آٹھ لوگ مارے جا رہے تھے۔ اس لیے وہ تشدد اور قتل و غارت گری کے شعلوں میں جھلستا ہوا شہر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے تازہ ہوا کھانے کے خیال سے بہت خوش تھی' اس بات پر تو اور بھی خوش کہ جہاز کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ "گڈ اولڈ لنڈن!" اس نے بخوشی ایک گھسا پٹا جملہ دہرایا۔ (منہ میرا کعبے شریف کی طرف' اللہ اکبر) اور لندن جانے کی نیت باندھ لی۔

زمین پر تیزی سے دوڑتا جہاز اب ہوا میں بلند ہو چکا تھا۔ نیچے شہر تھا' جو اس کی نظروں کے سامنے تیزی سے آڑا ترچھا ہو رہا تھا۔ گڑیا گھروں کی طرح چھوٹے پڑتے مکانوں' فیتوں میں بدلتی سڑکوں' کھجوروں کے مور پنکھوں اور ترچھے ساحل سمندر کو کھڑکی کے شیشے سے بغور دیکھتے ہوئے' جن پر دسمبر کے کمزور سورج کی پہلی کرنیں دمک رہی تھیں' عورت نے آنکھوں میں گرم پانی آتا محسوس کیا۔ اس نے شہر سے محبت اور سینے میں لاحاصل محبت کی شدید تکلیف محسوس کی' گویا کوئی تیز دھار چیز سینے میں پیوست ہو اور کوئی ان دیکھا ہاتھ اسے نکالنے کی کوشش کرتا ہو' مگر یہ کیفیت ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں رہی۔ گرم آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ اس کا دھیان کہیں اور لگ گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ انگلینڈ پہنچ کر کیا کیا کرے گی' اسے لینے کون آیا ہو گا اور دیگر یہ کہ اب چائے ملنی چاہئے۔

عورت کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ کی دو نشستوں پر ایئر ہوسٹس نے نہ جانے کیوں (اتنی بہت سی خالی سیٹیں چھوڑ کر صرف اسی کے ساتھ کیوں؟) دو مسافر بٹھا دیئے تھے جو کسی اور پرواز سے کراچی آئے تھے۔ ان میں سے ایک بڑے اشتیاق سے جھانک

جھانک کر کھڑکی کے نیچے دور کہیں ڈگمگاتے شہر کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ نیچے لانڈھی نظر آ رہا ہے کیا---؟" دبلے پتلے مسافر نے بڑے اشتیاق سے انگلی کا اشارہ کر کے پوچھا۔

عورت چکرا گئی۔ اتنی بلندی سے وہ لانڈھی کو کیسے پہچان سکتی تھی۔

"نہیں تو--- پتا نہیں---" اس نے کہا۔ پھر ایک نظر اپنے ہم سفروں پر ڈال کر سوچا کہ کیا وہ لانڈھی سے آئے ہوں گے۔ عورت نے آنکھیں موند لیں۔ اچانک اسے خیال آیا۔ لانڈھی کا کیا مطلب ہے؟ اس نے سوچا کہ وہاں اب رہنے والے یہ بات مشکل سے جانتے ہوں گے کہ سندھی زبان میں لانڈھی کا مطلب کوئی صاف ستھرا' آرام دہ جھونپڑا ہے جو گاؤں کے راستے میں مسافروں کے آرام کرنے کے لیے بنایا گیا ہو۔ شاید اس نے سوچا' صدی بھی پہلے' اس علاقے میں ایسی کوئی گھاس پھوس کی کٹیا ہو جہاں مسافر پل بھر آرام کرتے ہوں۔ اس نے ایک پرسکون راستے کا تصور کیا جہاں دو رویہ کھجوریں کھڑی ہوں اور جھاڑیوں میں کالے تیتر بولتے ہوں۔

لانڈھی--- اب شہر کا ایک خطرناک علاقہ' گولیوں کی بوچھاڑوں سے دھواں دھار۔

دور ہو تا گیا کراچی' مقتولوں کے خون سے جا بجا شرابور' وارداتوں کی کثرت اور اسرار پر بھونچکا۔

وہ حفاظتی پیٹی کو تھوڑا سا ڈھیلا کر کے' کرسی کی پشت پیچھے کھسکا کر' آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کے لیے سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔

آنکھیں بند کئے کئے عورت نے تصور کیا--- نہ جانے کیوں یہ خیال اس کے ذہن میں آیا' شاید اس لیے کہ شہر کی حالت واقعی بہت خراب تھی--- گویا کوئی اس سے سوال کر رہا ہو---

"بھئی کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟"

یہ ایسا سوال تھا جو دراصل اس سے کوئی نہ پوچھتا۔ اس شہر کے بارے میں لوگ سوال نہیں پوچھتے تھے بلکہ صرف تبصرہ کرتے تھے۔ کراچی کی تو حالت اتنی خراب ہے' وغیرہ--- مگر عورت کے تصور نے اس سے من چاہا سوال پوچھ لیا۔ (پورا تصور یہ تھا گویا کوئی اس سے انٹرویو لے رہا ہے۔)

عورت تصور میں اپنے تئیں ایک نہایت اہم اور معتبر شخصیت محسوس کرتے ہوئے

مفصل جواب دینے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے اس نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا---

"دراصل یہ ایک پیچیدہ صورتحال ہے۔ ایک سطح پر تو--- کہا جاتا ہے کہ یہ ایجنسیوں کی لڑائی ہے---"

"کیسی ایجنسیاں؟" اس کے چوکنے تصور نے سوال کیا' کیونکہ حال ہی میں امریکہ سے آئی ایک پاکستانی لڑکی نے حیرت زدہ ہو کر اسے بتایا تھا کہ وہ ایجنسیوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہے' دیگر یہ کہ اس کے اپنے باپ کی ایک اسٹیٹ ایجنسی تھی۔ لہٰذا عورت نے بلا تامل وضاحت کی۔

"بھئی خفیہ ایجنسیاں--- جن کے ایجنٹ ہوتے ہیں---"

"جیسے؟" انٹرویو کرنے والے نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ گڑبڑا گئی۔ ایجنسیوں کو حروف تہجی سے یاد کیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ انہیں گڈمڈ کر دیتی تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے' حواس مجتمع رکھتے ہوئے (کیونکہ وہ انٹرویو لینے والے پر اپنی جہالت زدگی اور کم علمی کو کسی قیمت پر فاش نہیں کر سکتی تھی) کہنا شروع کیا۔

"بھئی بہت سی ایجنسیاں لڑ رہی ہیں--- سی آئی اے ہے' آئی بی ہے' آئی ایس آئی ہے---" پھر کچھ جھجک کر اس نے اضافہ کیا۔ "سی آئی ڈی ہے---" حالانکہ یہ سوچ کر اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس قدیم ادارے کو کہیں برسوں پہلے ختم ہی نہ کر دیا گیا ہو۔

"اس کے علاوہ---" اس نے کہا۔ "ایم کیو ایم کے دو متحارب گروہ ہیں' پھر شیعہ اور سنی' سیاسی اور نیم سیاسی جماعتیں ہیں اور پھر---" وہ کچھ رک گئی' اس احساس کے ساتھ کہ بات پوری نہیں ہوئی۔ پھر اس نے کہا۔ "پھر پولیس ہے' رینجرز ہیں' شہری ہیں--- اور--- اور امریکی ایجنٹ ہیں' ہندوستانی ایجنٹ ہیں' افغان ایجنٹ ہیں--- تو یہ سب--- یعنی کہ--- لڑ رہے ہیں---"

انٹرویو لینے والے نے قہقہہ لگایا۔ عورت ہنس رہی تھی۔ خود ہی تولے رہی تھی وہ اپنا انٹرویو۔

"لاحول ولا قوۃ'" اس نے کہا' "کیا بکواس کر رہی ہوں میں!"

"تو پھر' کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟"

"واللہ اعلم!" عورت نے سر کھجایا۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "فائرنگ ہو رہی

ہے۔ روز کتنے ہی لوگ مارے جاتے ہیں' دس بارہ' دس بارہ' ہر روز---"

اسے اپنے پڑوس کی مسجد پر حملہ یاد آیا۔

روانگی سے دو دن پہلے اس کے محلے کی مسجد میں اکٹھے آٹھ آدمیوں کو مارا گیا تھا۔ مرنے والے کہا جاتا تھا سپاہ صحابہ کے تھے۔ کیا مارنے والے یقیناً شیعہ رہے ہوں گے؟ اس سے پہلے شیعوں سے بھری بس میں بم پھٹا تھا۔ اخباروں میں روزانہ مرنے والوں کی تصویریں چھپتی تھیں اور حالانکہ شہر کے لوگ مدت مدید سے ان اموات میں دلچسپی کھو بیٹھے تھے' پھر بھی کوئی کوئی شخص (مثلاً یہ عورت ہی) شہر کے معمے کو سمجھنے کی کوشش میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ مرنے والوں کا تعلق کس فرقے یا سیاسی جماعت یا لسانی گروہ سے ہے۔ بعض اوقات خبریں اس طرح ہوتیں۔

"مرنے والوں میں دو ایم کیو ایم کے کارکن' ایک ایم کیو ایم حقیقی کا کارکن' تین شیعہ اور دو سنی ہیں۔

پڑھنے والے اس گورکھ دھندے کو حل کرتے۔ یہ بات ناقابل یقین تھی کہ شہر میں مدت سے یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ ہلاک کرنے والے افراد نہ صرف ایم کیو ایم کے خلاف ہیں بلکہ حقیقیوں' شیعوں اور سنیوں کے بھی جانی دشمن ہیں۔ پھر وہ کھی کھی کر کے ہنستی۔ "ارے نہیں بھئی--- آپس میں ایک دوسرے کو مار رہے ہیں لوگ!"

کبھی لڑکپن میں وہ شمع معمے حل کیا کرتی تھی۔ یہ سب سے پہلے معمے تھے جن پر ہزاروں روپوں کے انعام ملتے تھے۔ اس زمانے میں ہزاروں روپے بڑی بات ہوتے تھے۔ حروف تہجی کے الفاظ خانوں میں بھرنے ہوتے تھے۔ "شمع" نامی رسالہ نئی دہلی سے نکلتا تھا اور پاکستان میں بکتا تھا۔ جس صفحے پر معما شائع ہوتا تھا اس کی پشت پر صحیح حل کے لیے کچھ "بجھاؤ" درج ہوتے تھے' ان کا دلچسپ اور خیال انگیز عنوان ہوتا تھا' "اشارے"

کراچی میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ بھی اب معما تھا۔ یوں ہی دل بستگی کے لیے لوگ اخباروں میں اشارے ڈھونڈتے' جبکہ صحیح حل پر کوئی انعام ملنے والا نہ تھا۔ بلکہ شاید صحیح حل کوئی تھا ہی نہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ یہ بلا حل معما ہو جسے صرف بے وقوف بنانے کے لیے پیش کر دیا گیا ہو' لوگ برسوں دماغ پچی کرتے رہیں اور پھر پتا چلے--- اوہو! ہمیں یوں ہی الو بنایا گیا۔

تھوڑی دیر میں فضائی میزبان چائے لے آتی ہے۔ ایک ٹرالی پر اخبار بھی ہیں۔ لڑکی اسے اخبار پیش کرتی ہے۔ خوشی سے تقریباً کپکپاتے ہوئے عورت نے اخبار لینے سے انکار کر

دیا- وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ وہ پہلے سے جانتی تھی اخبار میں کیا لکھا ہوگا (وہی دو شیعہ' ایک ایم کیو ایم' شاید ڈیڑھ حقیقی' وغیرہ) بلکہ اس لیے کہ اب وہ جاننا ہی نہیں چاہتی تھی' کم از کم مہینے بھر تو نہیں- ارے بھئی وہ باہر جا رہی ہے--- کوئی یوں ہی تو نہیں' اس اکتا دینے والے مسلسل تشدد سے بچ کر ہی تو وہ جا رہی ہے--- بلکہ (اس نے تفاخر اور تحقیر کی لہریں ناک اٹھا کر سوچا) وہ جا چکی ہے- یہ بات اب ماضی بعید کی ہوئی کہ وہ کراچی میں تھی- اخبار کے بدلے وہ فضائی کمپنی کے رسالے میں "کم سن مسافروں کے لیے" کے عنوان سے چھپے بندروں اور طوطوں پر لکھے باتصویر مضامین پڑھنے لگی- مضمون بے حد معلوماتی تھے اور تصویریں بہت دلکش تھیں- چند ہی لمحوں میں وہ ان میں کھو کر رہ گئی اور سوچنے لگی کہ دوبئی اترنے پر محصول معاف دکان سے وہ اپنی نواسی کے لیے مخمل کا بندر خریدے گی' کرسمس کا تحفہ!

وہ کرسمس کا دن تھا- اس کی بیٹی' داماد اور نواسی اس جگمگاتے دن اسے لینے ہوائی اڈے پر آئے ہوں گے- "فادر کرسمس کے بدلے مدر کرسمس آ رہی ہیں!" اس کی بیٹی نے دور دراز ٹیلی فون پر خوشی سے چیخیں مارتے ہوئے کہا تھا- عورت خوشی سے مسکرانے لگی- دور کہیں' اجنبی دیس کے ہوائی اڈے پر' خوشی اس کا انتظار کر رہی تھی' ایک سجے ہوئے شہر میں' جیسے اسے اس کی آمد کے لیے خاص طور پر سجایا گیا ہو' اس وقت وہ ہرگز نہیں جاننا چاہتی کہ کل کراچی میں کون کون مارا گیا' لانڈھی میں اور ملیر میں---

ملیر تو وہ خود گئی تھی- حیرت! حیرت! وہ ملیر کیوں کر جا پہنچی؟

مقتول کے گھر تعزیت کے واسطے' جبکہ لاش ہسپتال سے لائی جا رہی تھی-

ان دنوں دو تین روز سے قتل کی وارداتوں میں تیزی تھی- اچانک ایک صبح اسے خبر ملی کہ جس دفتر میں وہ بیٹھتی تھی وہاں کام کرنے والا ایک کلرک مارا گیا ہے- کون تھا وہ؟ اسے اس کی صورت بھی یاد نہ آئی تھی- یہ خبر اس نے ٹیلی فون پر سنی تھی' اور اس کی عجیب تفصیلات-

سرکاری دفتروں میں کام کرنے والے کم گریڈ کے زیادہ تر ملازم دفتری اوقات کے بعد' مہنگائی کے زمانے میں کسی طرح پورت کرنے کے لیے' کوئی اور بھی کام کرتے ہیں- یہ کلرک بھی--- جس کو زید' بکریا عمر کہیے--- دفتر کے بعد نمکو بیچتا تھا- تلی ہوئی دالیں' مرمرے' سیو' پاپڑ' نمک پارے وغیرہ وہ پلاسٹک کی تھیلیوں میں اسٹیپل کے دھتیلے تار کے دانت کے بند کر

کے (تاکہ وہ ہوا اور نمی سے محفوظ رہیں) اپنی موٹر سائیکل پر لوگوں کے گھروں اور دکانوں میں پہنچایا کرتا تھا-

واردات والے دن (مگر واردات والا تو ہر دن تھا! یعنی جس روز اس کے ساتھ واردات ہوئی) زید' بکریا عمر گھر نہیں پہنچا تھا- گھر والوں نے بہت دیر تک' یعنی اگلی صبح تک انتظار کیا- جب وہ صبح تک گھر نہ پہنچا اور آسمان پر سفید اور سیاہ سایہ نمودار ہوگیا' اور پھر وہ بھی پگھل گیا اور سورج مشرق سے جھما جھم طلوع ہوگیا اور چڑیوں نے پچھواڑے میں اگے امرود اور کیلے کے تین پیڑوں میں گانا اور چہچہانا بھی ختم کر دیا اور ان کے بدلے کراچی کے آسمان کی وہی شناسا چیلیں اور کوے چکر کاٹتے قصائی کی دکان کا رخ کرنے لگے جہاں دکان کے باہر پڑے چھچھڑوں پر بلیوں سے لڑتی ہوئی چیلیں اپنے حصے پر جھپٹے مارتی ہیں اور روشنی میں سب کچھ صاف نظر آنے لگا تو زید' بکریا عمر کی بیوی نے پوری طرح دہل کر ملگجے' ملے دلے بستر پر سوتے دیور یا جیٹھ کو جگایا اور کہا-

"وہ نہیں آئے-"

گھر والوں نے دفتر کھلنے کا انتظار کیا- ان کے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا- انہوں نے باہر کسی دکان سے دفتر فون کیا- انہوں نے استفسار کیا کہ کیا بات ہے' وہ دفتر سے گزشتہ رات گھر کیوں نہیں پہنچا؟ دفتر والوں نے حیرت اور پریشانی کے عالم میں بتایا کہ وہ تو دفتر کے وقت کے بعد سب لوگوں کے ساتھ گھر چلا گیا تھا- پھر کچھ توقف کے بعد انہوں نے مشورہ دیا کہ بھائی' حالات کچھ اچھے تو ہیں نہیں' خدا کرے سب خیریت ہی ہو' مگر آپ لوگ ذرا کسی ہسپتال میں بھی معلوم کر لیجیے- گھر والوں اور عزیز و اقارب نے ہسپتالوں سے رجوع کیا- دس بجتے بجتے ایک ہسپتال میں زید' بکریا عمر کی لاش کی شناخت ہوگئی اور یہ خبر بارہ بجے نکلنے والے اخباروں کے دفتروں میں بھی پہنچ گئی- وہیں سے کسی نے ٹیلی فون پر اسے بتایا تھا کہ اس کے دفتر کا ایک آدمی بھی کل رات---

بے تابی سے اس نے اپنے دفتر فون کیا تھا- وہاں اسے مزید تفصیلات بتائی گئی تھیں- یہ سب سن کر عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی- اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ اس قدر کیوں رو رہی ہے- بہرصورت وہ روتی دھوتی دفتر چل دی تھی-

دفتر کا نچلا اسٹاف تجہیز و تکفین کے لیے بسوں میں ملیر جا چکا تھا- صرف ڈائریکٹر اور ان کے نائب بیٹھے تھے- وہ منتظر تھے کہ ہسپتال سے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش گھر آ جائے اور

جنازہ اٹھنے والا ہو تو پھر وہ بھی ملیر جائیں۔ ملیر۔۔ جو پہلے شہر کے مضافات میں تھا۔

ملیر جاتے ہوئے وہ سڑک پر رواں ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ یہ رکشہ والے اور ٹیکسی ڈرائیور' اور اپنی گاڑیوں میں جاتے ہوئے لوگ' یہ سب جیسے کسی جنازے میں جا رہے تھے۔ ان کے چہرے سختی سے الم میں منجمد تھے۔ راستے میں اسے اور تفصیلات معلوم ہوئیں۔ لاش علی الصباح ہسپتال لائی گئی تھی۔ واردات شام کو ہوئی تھی جب زید' بکریا عمر نمکو تقسیم کر کے گھر واپس جا رہا تھا۔ رات بھر لاش سڑک کے کنارے پڑی رہی تھی۔

راستے میں اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ہم سفر ڈائریکٹر سے کہا' "فلاں بھائی۔۔۔" (جیسا کہ اس کے شہر کا قاعدہ تھا ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا' جسے اس نے غیر شعوری طور پر اپنا لیا تھا)' "آپ کو یاد ہے کئی برس پہلے۔۔۔ یہاں ملیر میں۔۔۔ ایک صاحب کے گھر ادبی محفل ہوتی تھی۔۔۔" اس نے ٹوٹے ہوئے جملوں میں کہا۔ یاد میں ایک چھوٹے سے گھر کا ایک نیم تاریک کمرہ بجلی کے پیلے' مدھم بلب سے روشن ہو گیا۔ فرش پر بچھی دری' اس پر سمٹ کر بیٹھے ہوئے لوگ' نظم یا افسانہ پڑھنے والے۔ سننے والوں کے تبصرے۔ اسے یاد آیا' کتنی کتنی دور سے جاتے تھے لوگ وہاں۔ وہ خود کتنی دور سے گئی تھی۔ تب دھوراجی کالونی میں رہتی تھی وہ۔ ڈائریکٹر صاحب ذرا دیر خاموش رہے۔ پھر ان کی ٹوٹی ہوئی سی آواز آئی۔

"ہاں صاحب' خوب یاد ہے۔ میں خود وہاں جاتا تھا۔"

"پھر ان صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ محفلیں ختم ہو گئی تھیں۔" عورت نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ آخری بار اس گھر میں وہ سب تعزیت کرنے گئے تھے۔

"نہیں' ختم تو نہیں ہوئی تھیں۔ ان کی بیوی نے جاری رکھی تھیں۔" ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔

کامریڈ تھے وہ صاحب' اسے مدھم سا یاد آیا۔ یہ ایک سوشلسٹوں کا حلقہ تھا۔ لینن اور مارکس کے نظریات پر وہاں طویل بحثیں چلتی تھیں۔

ایک موڑ کاٹ کر گاڑی ملیر میں داخل ہو گئی۔

علاقے میں مرگھٹ کا سا سناٹا تھا۔ اکا دکا دکانوں کے سوا تمام دکانیں بند تھیں۔ ڈرائیور فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ آگے جائے یا نہیں۔ یہ ایک فساد زدہ علاقہ معلوم ہو رہا تھا۔ سڑک پر ایک آدھ جگہ لوگ گچھا سا بنائے کھڑے تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کو مشکوک نظر آ رہے تھے اور خود انہیں شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

تبھی انہیں سامنے سے ایک کھٹارا بس آتی نظر آئی جس میں چند مسافر بھی تھے۔ بس اسٹاپ پر نہ جانے کہاں سے ایک عورت آ کھڑی ہوئی۔ سڑک پر عورت: امن کے آثار! انہوں نے ہمت کر کے آگے جانے کی ٹھانی۔

لاش ہسپتال سے یا تو آ چکی تھی یا وہاں سے روانہ کر دی گئی تھی۔ اسے ٹھیک سے پتا نہ چل سکا کیونکہ اسے گھر کے اندر عورتوں کی طرف بھیج دیا گیا۔ چھوٹی سی کچی انگنائی پار کر کے گھر تھا' عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی عورتیں۔ کسی نے اشارے سے اسے بتایا۔ "یہ ان کی اماں اور وہ بیوی ہیں۔"

بیوی تیس کے پیٹے میں رہی ہو گی۔ روتے روتے نڈھال' لانبی اور چھریری۔ اس کی ناک میں کیل چمک رہی تھی۔ موٹی ململ کا گلابی دوپٹہ' ٹانگوں میں سفید لٹھے کا پہناوا' چست پاجامے کی کفایتی شکل جو گھٹنا کہلاتی ہے۔ ارے واہ! اس نے دل میں سوچ کر حیرت کی۔ یہ تو بالکل سونی پت یا ریواڑی کے کسی مسلمان محلے سے نکلی تصویر لگ رہی ہے' مومیائی ہوئی۔ پچاس برس میں ان گھروں کی اندرونی حالت جوں کی توں رہی کیا؟ مگر نہیں' یہاں پہلے گھر تھے کہاں؟ جھگیاں ہی جھگیاں تھیں چند دہائیوں پہلے تک۔ اور اب ہر طرف پکے گھر کھڑے تھے۔ راستے میں وہ یہی تبصرہ کرتے آئے تھے۔ اس کچی آبادی پر جو اب کھوکھراپار تک جا پہنچی تھی۔

کھوکھراپار۔۔۔ ہجرت کی سرحد!

بیوی نے ہاتھ اٹھایا۔ کلائی میں کانچ کی چوڑیاں چھنکیں۔ اس کے زانو پر اسی چہرے مہرے کی تیرہ چودہ سالہ لڑکی سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ یہ زید' بکریا عمر کی بیٹی تھی۔ دو چھوٹے بچے وہیں کہیں دوسرے بچوں میں رل کھل رہے تھے۔ اب یہاں تک پہنچ کر عورت کو بالکل رونا دھونا نہیں آ رہا تھا۔ اس نے چبا چبا کر تعزیتی جملے بھی کہہ دیئے تھے۔ یہاں اسے رونا چاہئے' اس نے سوچا۔ اس قدر رقت انگیز سین ہے اور اسے رونا نہیں آ رہا۔ وہ غور کر رہی تھی کہ مجمع میں لوگ زیادہ تر اس بات پر زور دے رہے تھے کہ زید' بکریا عمر کا تعلق کسی سیاسی جماعت یا دھڑے سے نہیں تھا۔ باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ مردوں میں بھی یہی باتیں ہوئی تھیں۔ لوگوں کی ملی جلی رائے یہ بن رہی تھی کہ زید' بکریا عمر دراصل اس روز نمکو والوں سے وصولی کر کے آ رہا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کیا اور پیسے لے کر فرار ہو گئے۔ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

واپسی میں اس کے ہم سفر ڈائریکٹر صاحب نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی۔ "کچھ نہیں صاحب، محض غنڈا گردی کی کارروائی ہے، پیسوں کے لیے۔"

تعجب اس پر تھا کہ یہ بات سب کے لیے باعث اطمینان کیوں تھی۔ دیگر یہ کہ اس بات پر مقتول کے عزیز اتنے مصر کیوں تھے اور اس قدر جلد بازی سے، جبکہ ابھی جنازہ ٹھنڈا بھی نہیں ہوا تھا، شرکائے جنازہ کو کیوں یقین دلانا چاہ رہے تھے کہ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

خیر، اس نے سوچا، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ مقتول کے عزیز و اقارب ڈرتے ہوں گے۔ اگر کسی پر قتل کا الزام آتا ہے تو انتقامی کارروائی میں دوسروں کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جنازے میں شریک معتبر، بااثر، اعلیٰ افسر قسم کے لوگ اس بات پر کیوں مطمئن نظر آ رہے تھے کہ یہ محض غنڈہ گردی ہے اور اس قتل کا اس شہر کے تار و پود میں پڑی سیاسی گرہ سے کوئی تعلق نہیں؟

اس بات میں عجیب سا اطمینان تھا۔ نہیں صاحب، محض غنڈا گردی ہے! سارا زور "محض" پر تھا۔ کیوں؟

دوسری صورت میں سیاسی الجھاؤ اور اس کے ممکنہ حل کو فوکس میں لانا ناگزیر ہو جاتا نا، اس لیے اس منطق پر قدم بہ قدم چلا جائے کہ:

1 اس قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔
2 کسی قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔
3 ہم جو کوئی سیاسی رائے نہیں رکھتے اور اس کا اظہار کرنے سے بھی اب پرہیز کرنے لگے ہیں تو ہم خصی نہیں ہو گئے۔
4 اس قتل میں یا کسی بھی قتل میں، ہماری کوئی ذمے داری نہیں۔

ایک محلے والا سفاکی اور عیاری سے مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور رازداری سے گویا ہوا:

"خوب صاحب، پیسوں کے لیے قتل کیوں کر ہوا ہو گا؟ جیب میں اس کی تین چار سو روپوں سے زیادہ رقم نہ تھی۔ گولی بہت قریب سے ماری گئی ہے۔ قمیض کی جیب کے پاس خون کا معمولی سا داغ ہے۔ یہ تو---" اس نے سرگوشی میں کہا، "کوئی اور ہی معاملہ لگتا

ہے۔"

کیا یہ بدبخت اس قتل کو سیاسی ثابت کرنا چاہتا ہے؟ آنے والوں نے سنسنا کر سوچا تھا۔ خوفزدہ آنکھوں سے انہوں نے متحارب گروہوں کے اس گڑھ میں فاصلوں پر کھڑے لوگوں کے مشکوک گچھوں کو دیکھا تھا اور سرعت سے کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تھے۔

راستے میں انہوں نے اس بات پر غور کیا تھا کہ زید، بکر یا عمر کیوں کر گولی کھا کر مرا۔ کئی امکانات تھے:

1 کہ یہ محض ایک ڈاکے جمع قتل کی واردات تھی۔
2 کہ وہ ایم کیو ایم کا تھا اور حقیقی والوں نے قتل کر دیا۔
3 کہ وہ حقیقی والوں کا تھا اور ایم کیو ایم نے مار دیا۔
4 شیعہ تھا، سینوں نے قتل کر دیا۔
5 سنی تھا، شیعوں نے مار دیا۔
6 حالات خراب کرنے کے لیے بغیر نشانہ لیے چلائی گئی گولیوں کی زد میں یوں ہی آ گیا۔

زید، بکر یا عمر کو کس نے قتل کیا؟

اچانک آسمان پر بادل چھا گئے۔ عورت نے سندھ کے شاعر شاہ لطیف کی ایک نظم یاد کی جو انہوں نے کراچی پر لکھی تھی۔ کیا تب بھی "کرانچی" تھا؟ ہاں، تب بھی تھا۔ ایک چھوٹا سا مچھیروں کا گوٹھ، کلانچی۔ وہاں ایک مچھیرا اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دن بھر سمندر میں مچھلیاں پکڑتے اور شام پڑے گھر لوٹتے۔ کہیں سے سمندر میں ایک مگرمچھ آ نکلا اور پھر ایک دن وہ مچھیرا گھاتو گھر نہ لوٹا۔ یہی نظم تھی۔

گھاتو گھر نہیں آیا
شام پڑ گئی اور پھر رات
گھاتو گھر نہیں آیا

کار کے بونیٹ پر ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

مسئلے کا حل

"سیاسی مسئلہ حل کرنا ضروری نہیں ہوتا" فلائٹ پی کے سات چار پانچ میں بیٹھی عورت نے ذاتی، تقریباً نجی مشاہدوں پر مبنی ایک نجی، سنہرا نتیجہ اخذ کیا۔ "مسئلے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو کچھ عرصے بعد، آکسیجن کی کمی کے باعث وہ مرجاتا ہے۔ پھر اس کی لاش گلنے سڑنے لگتی ہے۔ بدبو پھیلتی ہے۔ کیڑے مکوڑے گلا سڑا گوشت کھانے آنکلتے ہیں۔ غرض جب تک مسئلہ خاک میں ملے، خوب گند پھیلاتا ہے۔"

وہ اس نادر و نایاب نظری تشکیل پر خوش ہونے کی کوشش کرنے لگی، شہر میں ہر روز پابندی سے گرتی لاشیں یاد کر کے جو اس شہر میں رہنے والوں کے وجودی نظاموں میں گرتی رہی تھیں! انتظامیہ تمام آثار و شواہد کے مطابق معدوم ہو چکی تھی اور چند دنوں میں محسوس ہونے لگا تھا کہ کراچی کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے، جبکہ قتل و غارت گری کی قوتیں بلا جھجک یا روک ٹوک ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔

اس شہر کی (ایک حد تک پوری ریاست کی) آبادی پر ٹھونسی ہوئی بے عملی (درحقیقت بے بسی) کی پینک میں عورت نے اس طرح کی کئی سنہری عمرانی نظری تشکیلات پلو میں باندھ لی ہیں جن پر وہ گاہے بگاہے خوش ہونے کی کوشش کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سیاسی تنظیمیں مار کھانے سے ختم نہیں ہوتیں۔ اگر طویل عرصے تک کوئی سیاسی جماعت کچلی جاتی رہے (بقول سندھیوں کے، "موچڑوں میں رہے") تو وہ مرتی نہیں بلکہ لولی لنگڑی، اندھی کانی یا گونگی بہری ہو جاتی ہے۔ پھر جب طاقتور عناصر اسے اپنے کام میں لانا چاہیں تو وہ لکڑی کی ٹانگ یا کانچ کی آنکھ لگائے، پھدکتی ہوئی میدان عمل میں آتی ہے۔ وہ پہلے جیسی باقی نہیں رہی

ہوتی۔ دیکھنے والے کچھ ہی عرصے میں سمجھ جاتے ہیں کہ یہ اب اپنا ہی ایک نوحہ ہے' اپنے ماضی کا ایک مسخ خاکہ۔ پھر آپ اگر اسے حکمران بھی بنا دیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کی اصل طاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ حکمران بن کر تو اور بھی بے ضرر ہو جاتی ہے۔ موچڑوں کی یاد اس کے حیاتیاتی خلیوں میں سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ متوقع جھانپڑ سے بچنے کے لیے وہ ہمیشہ کہنیوں سے منہ ڈھانپ کر بات کرتی ہے۔ متواتر مار کھانے کے بعد آپ اسے الزام نہیں دے سکتے۔ وہ جنات یا آسمانی طاقت سے بہرہ ور پہلوانوں کا گروہ نہیں تھا' محض فانی اور انسانی کمزوریاں رکھنے والے لوگوں کی ایک سیاسی جماعت ہی تو تھی۔

ہوائی میزبان ان کے لیے ناشتہ لائی۔ عورت کا خیالی انٹرویو ادھورا رہ گیا۔

انٹرویو کا خیال دراصل اسے اس لیے آیا تھا کہ چند دن پہلے اخباروں میں مولانا عبدالستار ایدھی کا انٹرویو چھپا تھا۔ وہ کراچی سے پراسرار طور پر لندن جا پہنچے تھے۔ ان کی بات غیر ملکی ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر بھی ہوئی تھی۔ ملک کے نامور' ہر طبقے میں محترم' عمر رسیدہ' سماجی' فلاحی شخصیت' وہ اپنے گجراتی لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "میرے کو قتل کرنے کا پلان ہے پھر مزار بھی بہت بڑا بنوائیں گے' پھر کہہ دیں گے کہ ایم کیو ایم نے یا کسی مذہبی جماعت نے مارا۔ ارے' میں کہتا ہوں یہ سب مت کرو۔ اس سے تو ڈائرکٹ آ جاؤ۔ بات یہ ہے بھائی کہ پاکستان میں سچ لکھا نہیں جا سکتا۔"

پاکستان سناٹے میں آ گیا تھا۔ یہ کیا ہوا! اس نے تو بھانڈا ہی پھوڑ دیا۔ ناگفتنی بات کہہ ڈالی۔ لوگ دم بخود منہ پھاڑے دن بھر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ مشکل اخبارات کی تھی جو آزادی اظہار کے اس جمہوری دور میں عاقلانہ اور فاضلانہ مقالات کے ذریعے عرصے سے کچھ نہ کہنے کی سعی میں مصروف تھے۔ پھر لوگ ذرا کھانسے' گلا صاف کیا' کسمسائے۔ اخباروں نے مرے مرے لہجے میں کچھ تبصرہ کیا۔ ایک انگریزی اخبار نے اداریئے میں لکھا۔ "مولانا نے ایجنسیوں کی طرف اشارہ کیا ہے' وغیرہ وغیرہ۔" اور یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔

پھر بڑی سرعت سے اخباروں نے موضوع بدل دیا۔ وہ اس بدقسمت شہر کے روگ کی تشخیص سے گریزاں تھے جس کی بدامنی ضرب المثل بن چکی تھی۔ شہر کراچی پاکستان ہی کا سب سے بڑا نہیں' اپنی گنجان آبادی اور حیرت انگیز پھیلاؤ کے باعث دنیا کے بڑے شہروں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ ریاست کی معیشت کی شہہ رگ' ریاستی خزانے کو سب سے زیادہ رقم فراہم

کرنے والا' ملک کا سب سے زیادہ (درحقیقت واحد) جدید شہر' موٹر کاروں سے رواں' کسی بھی جدید کاروباری میگاپولس کی طرح غریب سے غریب اور مالدار سے مالدار شہریوں کا مسکن' جس کی اب برسوں کی بے توجہی اور بدامنی سے ادھڑی ہوئی سڑکوں پر ننھی منی منی موروں اور بیتے برسوں کے کسی تہہ خانے سے ثابت و سالم اور صاف ستھری نکل آئی فوکس ویگنوں کے ساتھ ساتھ سال رواں کے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو گاڑی بھی نظر آ سکتی ہے۔ جہاں ملک کے مہنگے ترین فائیو سٹار ہوٹلوں کے ساتھ ساتھ سستی ترین نہاری بھی میسر آ سکتی ہے اور جہاں برسوں سے' کبھی تیز تواتر کے ساتھ اور کبھی رک رک کر سڑکوں پر محلوں پر گولیاں برسا کر بیک وقت متعدد مقتولوں کی لاشیں گرائی جاتی رہی ہیں۔ محلے محلے میں وارداتیں۔ ایسا زمانہ :ب شہری سانس روک کر سوچتے تھے۔ "آج کس علاقے کی باری ہے؟" جس شہر کی [illegible]... صرف خبریں پڑھ کر... محفوظ فاصلے پر واقع ملک کے دوسرے شہر اب نفرت [illegible] لگے تھے (ملک کے امور خارجہ کے سیکریٹری بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ہم تو کراچی کو اتنا چاہتے ہیں کہ کوئی نہ چاہتا ہوگا۔" غیر ملکی نشریاتی ادارے کے سامنے اعتراف کی مانند' گویا دنیا سے یا غالباً سماج سے چھپائے ہوئے اپنے شہر سے اس عشق کے اظہار پر تشدد کی لپیٹ میں آئے ہوئے شہری زار و قطار روتے اور ہنستے ہوئے!) جہاں ہمیشہ گڑبڑ رہتی ہے جہاں سے لاشیں لوٹائی جاتی ہیں اور گجرات اور پشاور' جانے کہاں کہاں بھیجی جاتی ہیں۔ جہاں کے شہری پاگل ہیں' جنونی ہیں۔ جہاں مسلح لڑکوں کے ٹولے اور شہریوں اور راہ گیروں پر بندوقیں تانے سپاہیوں کے ٹرک' یکساں دہشت پھیلاتے' برسوں سے گھوم رہے ہیں' جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔

پاکستان میں کیا سچ نہیں لکھا جا سکتا؟ عورت سوچتی ہے۔ کیا یہ کہ دہشت گردی کی وارداتیں حکومت کو متزلزل کرنے' بدلنے کے لیے' حالات کو ایک نیا من چاہا موڑ دینے کے لیے طاقتور اداروں کی جانب سے استعمال کی جا سکتی ہیں' جیسے کرسی کے نیچے سے قالین گھسیٹنے کے لیے جھٹکے دیئے جائیں؟ (جیسے ہندوستان میں بعض اوقات ہندو مسلم فسادات کرا کے کیا جاتا ہے' یا جیسے اندرا گاندھی کے قتل کے بعد راجیو گاندھی کو فوری طور پر وزارت عظمیٰ کی گدی پر بٹھانے کے لیے مبینہ طور پر کانگریسیوں نے سکھ ہندو فسادات کروائے تھے؟) یا یہ کہ گو بظاہر ملک میں جمہوریت ہے (فری ورلڈ کی ایک اور کامرانی' مسلح آمریت کے دقیانوسی نظام سے نکال کر جمہوریت میں داخل کی ہوئی ایک اور شادماں ریاست' نئے عالمی نظام کے

تاج میں سرخاب کا پر' جس پر یوروپ اور امریکہ کے حساس اور نازک دل انسانیت پرست مہذب حلقے سکون کا سانس لے سکتے ہیں' بلکہ ایک دوسرے کو مبارک باد دے سکتے ہیں) مگر درحقیقت سابق حکمران فوجی جنرل کی ایک دن اچانک فضا میں دھماکہ دار تحلیل کے باوجود ملک میں حکومت کسی سیاسی جماعت کے ہاتھ میں آئی نہیں ہے اور یہ کہ انتخابات کے متعدد بار انعقاد کے باوجود جس کے بعد حکومتیں کرسی اقتدار پر بٹھائی اور اٹھائی اور پھر بٹھائی جاتی رہی ہیں مگر اس تمام اٹھک بیٹھک کے کھیل میں اصل قوت ہنوز روپوش ہاتھوں میں ہے؟

کراچی کیوں تشدد کے سفاک خونیں پنجے میں سسک رہا ہے؟ اور اس کے شہری--- اس کے شہری کن حالات سے گزر رہے ہیں؟

کہا جا سکتا تھا' عورت نے سوچا' کہ آمریت سے جمہوری جدید ریاست بننے کا عمل ہموار نہیں ہوتا اور اس میں رکاوٹوں کا در آنا ناگزیر ہوتا ہے مگر شاید اس نے سوچا' منفی حالات اس قسم کے ہر ملک میں اس طرح اپنے عروج پر نہیں ہوتے جیسے اس کے اپنے وطن میں ہیں اور ممکن ہے تضادات بھی لازماً اتنے متنوع اور متعدد نہ ہوتے ہوں۔

اس کے ذہن میں بنگلہ دیش کا خیال آیا۔ جو طویل مدت بعد فوجی حکومت کے دور سے نکلا تھا' ایک تقریباً یک قومی ریاست جو کئی لحاظ سے اس کے اپنے وطن سے بہتر صورتحال رکھتی تھی' جبکہ اس کا وطن کسی لاطینی امریکی یا نو آزاد افریقی ریاست سے زیادہ مماثل تھا جہاں آزادی اظہار ملنے تک اظہار کے وسائل مسخ اور برباد ہو چکے تھے۔ خفیہ ایجنٹوں سے بھرے ہوئے' خوفزدہ' دولت مند مالکان کے یہ اخبارات سچ لکھنے سے معذور تھے۔ قومی زبان کے اخبارات' جنہیں ملک کی خواندہ آبادی کا بڑا حصہ پڑھ سکتا تھا' سنسرشپ کی طویل' ریاست کی تقریباً تمام تر زندگی پر محیط روایت سے جاں بر نہ ہو سکے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اشاعت رکھنے والا اخبار توازلی و ابدی طاقتور عناصر کی خوشنودی کا اتنا عادی تھا کہ اسے فسطائی رجحانات کی چھت کا مضبوط ترین ستون قرار دیا جا سکتا تھا۔ انگریزی اخبارات' جو آمریت کے اختتامی دور میں حکومت پر نکتہ چینی کے لیے نسبتاً آزاد تھے' مقامی قارئین کی کم تعداد تک پہنچ سکتے تھے' مگر مغربی دنیا' خصوصاً امداد دینے والے ملکوں کے واسطے' جو اب امداد کے ساتھ حقوق انسانی کی بخ لگا رہے تھے' اس ملک میں آزادی اظہار کے مزین نمائشی جھروکے کا کام دے سکتے تھے۔ اپنے بہتر شعور اور روشن خیالی کے باوجود بے بس اور حد درجہ محتاط تھے اور ایک مشکل وقت سے گزر رہے تھے۔ ان کے لیے بھی یہ حقیقت ناگفتنی تھی کہ

اصل طاقت کن عناصر کے پاس ہے۔ اس غیبی طاقتور ہاتھ کے لیے انہوں نے' حیاداری کے ساتھ "اسٹیبلشمنٹ" کی ترکیب اختراع کر لی تھی تاکہ پہلو بچا کر اس کا ذکر کر سکیں' یا گاہے گاہے اس کو کوئی دردمندانہ مشورہ دے سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مدت سے پڑھنے والے ان میں شائع شدہ تبصروں کیا رپورٹوں تک پر اعتماد کرنا چھوڑ چکے تھے اور انہیں محض یہ اندازہ لگانے کے لیے پڑھتے تھے کہ ان گنت ایجنٹوں کے ذریعے داخل (پلانٹ) کی گئی یہ خبریں کس خفیہ ادارے نے لکھوائی ہیں اور ان کی بنیاد پر آئندہ حالات کے کون سا رخ اختیار کرنے کی پیشینگوئی ہو سکتی ہے۔

ملک کی سیاسی جماعتیں' جن کا مفاد سونے کی چڑیا' اس شہر کراچی' سے وابستہ تھا' گو صالح نہ تھیں مگر ان کی کم شعوری یا نااہلی کو اس پس منظر میں دیکھنا ناگزیر تھا کہ کم از کم تیس برس کے طویل عرصے میں ظاہر یا پس پردہ آہنی طاقتور ہاتھ نے عوامی حمایت رکھنے والی ہر سیاسی تنظیم کو بزور طاقت کچلنے اور پھر ساز باز' اندر ہی اندر گٹھ جوڑ' رسہ گیری' دھمکی' بلیک میل اور نرخرے پر گھٹنا رکھنے کے مسلسل عمل کے ذریعے--- اس سے قبل کہ وہ سنبھلے اور روپوش ہاتھ کے پس پردہ اشاروں اور امداد کے بغیر کاروبار حکومت چلا سکے--- اپاہج بنا دیا تھا اور برسوں اس بات کا پروپیگنڈا کیا تھا کہ دراصل یہی پوری قوم کے مفاد میں ہے۔ تیسری دنیا کے نو آزاد' عوام دوست نظام قائم کرنے کے لیے تڑپتی ریاستوں میں وہ ادارے جنہیں ماضی میں خود مغربی جمہوریتوں نے پالا تھا' اپنے تسلسل اور عام لوگوں کی ان تک نارسائی کے باعث اب ایسے قائم بالذات طبقے بن چکے تھے جن کے دانت معیشت کی رگ گلو میں پیوست تھے اور جو نو آزاد ریاستوں کا ایک بالکل نیا فنامن (phenomenon)' ایک جدید مظہری وقوعہ تھے جو ابھی مغرب کی عمرانی کتب میں شامل نہیں کیئے گئے تھے۔

مگر کراچی ہی کیوں؟ آخر یہ شہر اس ہولناک تشدد کا شکار کیوں ہو رہا ہے؟

کیونکہ یہ سچ بھی لکھنا ہمت کی بات ہے کہ کراچی تیسری دنیا کے کسی عام سے ملک کا عام سا شہر نہیں تھا۔ یہ ایک خاص الخاص ملک کا خاص شہر تھا' دنیا کی دو بڑی ریاستوں کی رسہ کشی میں سامنے کا فریق بننے کا اعزار رکھنے والے ملک کا ایسا شہر جس پر سرد جنگ کو اختتام پذیر کرنے والی افغان جنگ اور اس کی خاطر جلد بازی میں کی گئی کچی تعمیروں کے ٹوٹ کر دھڑام سے زمین بوس ہونے کا تمام دھماکہ خیز ملبہ برسوں سے گر رہا تھا' ایسا شہر جسے اس ملک کے جنگجو حکمرانوں نے جرائم' تشدد اور مذہبی جنون کی تاریک جہالت کا زہریلا فضلہ پھینکنے کے لیے

کوڑے دان کی طرح استعمال کیا تھا' جبکہ وہ خود ایک خواب خرگوش میں فتح و نصرت کے ڈنکے بجا رہے تھے اور اس وقت جب وہ جرائم' تشدد اور تاریک جہالت کو کام میں لاتے ہوئے' دنیا کو یک قطبی (uni-polar) بنانے کی مہم میں جتے تھے (کیونکہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے)' یہ زہریلا فضلہ شہر کی نسوں میں رواں تھا۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

دوبئی کا درزی

عورت کے ساتھ والی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافر لانڈھی سے نہیں آئے تھے۔ جیسا کہ اسے بعد میں معلوم ہوا اور یہ معلوم کر کے اسے حیرت بھی ہوئی' وہ ہندوستان سے آئے تھے۔

"اخاہ! تو کیا آپ وہاں پی آئی اے سے سفر کر سکتے ہیں؟" اس نے تعجب سے پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں" انہوں نے ترنت جواب دیا تھا۔ "ایئر انڈیا سے آدھی قیمت پر لے جاتے ہیں۔"

اس کے برابر والی نشست پر ایک سانولی' سوکھی کانکھ عورت بیٹھی تھی' تیز جامنی ساری اور گہرے سیاہ بالوں کا بڑا سا جوڑا جس کو بھگونے والے ناریل کے اصلی تیل کی تیز' کچی نباتی مہک ان کی چائے اور کافی میں گھل رہی تھی۔ وہ آندھرا پردیش سے آئی تھی اور اب دوبئی میں کسی شیخ کے پاس آیا گیری کے لیے جا رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھا مرد الہ آباد سے دوبئی جا رہا تھا۔ دوبئی میں اس کا درزی کا کام تھا' جیسا کہ اس نے بتایا۔

"آپ کبھی کراچی گئے ہیں؟" عورت نے اسے اتنے اشتیاق سے ہزاروں فیٹ کی بلندی سے لانڈھی کو پہچاننے کی کوشش کرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"جی نہیں" درزی نے الہ آباد کی پختہ' الفاظ کے شستہ صوتی زیر و بم رکھنے والی اردو میں جواب دیا۔ "بس ہوائی اڈے پر رکے ہیں دو ایک گھنٹے کے لیے۔"

"تو آپ کے رشتے دار ہوں گے یہاں؟"

"جی ہاں' دونوں چچائیں ہیں' لانڈھی میں رہتے ہیں۔ پار سال والدہ گئی تھیں۔"

"ویسے ہندوستان کے حالات اب کیسے ہیں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔ ایسا سوال جو ہر پاکستانی ہندوستانی مسلمانوں سے پوچھتا ہے۔

"جی ٹھیک ٹھاک ہیں اب تو" درزی نے کہا۔ "وہ جو پہلے پریشانی سی تھی سو تو اب دب دبا گئی۔"

"تو اب---" عورت نے کچھ گول مول سا سوال کیا تھا' "کچھ گڑ بڑ نہیں آپ کی طرف؟"

"بالکل نہیں۔" دونوں ہندوستانیوں نے سرہلایا۔ عورت آندھرا کی آیا کا اندرون ملک آمد کا کارڈ بھر رہی تھی (کیونکہ آیا کو اردو یا انگریزی نہیں آتی تھی) اور اس وقت اس کے پاسپورٹ سے نقل کر کے اس کا مشکل سا تیلگو نام لکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ آندھرا کے کسی بالکل گمنام گاؤں میں پیدا ہوئی تھی اور یہ تازہ' نیا نکور پاسپورٹ اسے حیدر آباد (دکن) سے ملا تھا جہاں ہو سکتا ہے وہ خاص اسی مقصد کے لیے گئی ہو۔ اس کے سوال کے جواب میں "نہیں نہیں" میں سرہلاتے ہوئے وہ مسکرائی تو اس کے سفید دانت سیاہ لبوں میں چمکے۔ عورت کو اس کی نظروں میں امید بھری التجا دکھائی دی گویا کہتی ہو' ہندوستان میں ہندو مسلم جھگڑا بالکل نہیں ہو رہا' اے مسلمان عورت' تو میرا کارڈ صحیح صحیح بھر دے۔

دوبئی میں پتے کا خانہ بھروانے کے لیے اس نے سفید پلاسٹک کی جالی کے تھیلے سے بڑے بڑے رنگین پھولوں والے ریشمی رومال میں بہت احتیاط سے لپیٹا ہوا ایک کاغذ نکالا۔ شیخ کا نام اور پوسٹ بکس نمبر لکھوانے کے بعد کاغذ تہہ کر کے اس نے دوبارہ اسی طرح احتیاط سے تھیلے میں واپس رکھ دیا۔

"کیا اتنا کافی ہو گا؟" عورت نے کچھ تشویش سے پوچھا۔

"جی ہاں' جی ہاں بالکل کافی ہو گا" درزی نے فوراً کہا۔ وہ بڑی توجہ سے کارڈ بھروانے میں اپنی ہم وطن انجان تیلگو عورت کی مدد کر رہا تھا۔ چند گھنٹوں کے سفر میں ان دونوں میں جیسے کوئی بندھن بندھ گیا تھا۔ عورت نے سوچا' دوبئی اترنے پر درزی کمال ذمے داری سے آیا کو بخیریت شیخ کے حوالے کرے گا۔

وہ کون تھی؟ کیا شادی شدہ تھی؟ کیا اس کے بچے تھے؟ عورت یہ سب کچھ آندھرا کی آیا کی زبان نہ جاننے کے باعث اس سے نہ پوچھ سکی۔

وہ درزی سے باتیں کرنے لگی۔ توقع کے عین مطابق درزی خوشحال تھا۔ جی ہاں دوبئی

میں تین رشتے داروں کو کام پر لگا چکا تھا۔ بیوی بچے وہیں الہ آباد میں رہتے تھے لیکن وہ خود ہر دو ایک سال بعد چکر لگا آتا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی بی کام میں پڑھتا ہے' اب وہ بھی اگلے سال دوبئی آ کر اس کا ہاتھ بٹائے گا۔

"لیکن" درزی نے تحمل سے کہا' "بی اے' ایم اے کیا ہوتا ہے بیگم صاحبہ! لاکھوں پڑھے لکھے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ دو چار ایم اے پاس کو تو---" اس نے سکون سے کہا۔ "خدا کے فضل و کرم سے میں خود اپنے پاس نوکری دے سکتا ہوں۔"

ہمارا دوبئی کا درزی تعلیم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا تھا۔

"لیکن---" عورت نے چونکہ چنانچہ کے چکر میں پڑتے ہوئے بات آگے بڑھائی تھی' "تعلیم بھی تو ضروری ہے نا' یعنی روشن خیالی' سمجھ بوجھ' عقل و دانش وغیرہ کے لیے---"

درزی مسکرانے لگا۔

عورت نے شرمندگی سے کہا' اس کے لیے آج کل ایک باقاعدہ اصطلاح ہے--- یعنی تربیت اور تعلیم کے لیے--- ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ--- انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما۔

پھر اس نے کہا' "ہمارے وہاں کے ایک شاعر نے بھی ایسا ہی ایک شعر کہا ہے۔"

"کیا شعر کہا ہے؟ ارشاد' ارشاد"

بھلا یوپی کا آدمی اور شعر نہ سننا چاہے!

عورت نے پاکستانی مزدور شاعر کا شعر سنایا۔

کاریگروں نے بابوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آنچ کاغذی اسناد کھا گئی

"واہ وا! بہت خوب!" درزی نے قہقہہ لگا کر داد دی۔ اس نے عورت کو بتایا کہ وہ دوبئی میں اپنے یار دوستوں کے لیے الہ آباد کے شہرۂ آفاق امرودوں کے کریٹ لے جا رہا ہے' اگر اسے خبر ہوتی کہ راستے میں اسے شعر سنانے والی ہم سفر ملے گی تو وہ ایک کریٹ اوپر ہی رکھ لیتا' اسے نذر کرنے کے لیے۔

گھبراتی ہوئی اور اپنے سانولے سوکھے وجود کی پوری قوت سے گھبراہٹ کو چھپاتی ہوئی تیلگو آیا کے برعکس' درزی دوبئی لوٹنے پر خوش تھا۔ مسرور اور پراعتماد۔ آخر وہ وہاں دس بارہ سال سے رہ رہا تھا۔

پھر وہ عورت کو اپنے گھر کے قصے سنانے لگا۔

"دیکھیے صاحب' حسد بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے مکان کی مرمت کروائی ہے دو تین کمرے چھت پر بھی بنائے ہیں--- تو اب کی بار میرے وہاں ہوتے ہوئے پڑوسیوں نے ہماری شکایت کر دی۔ پہلے ان سے بہت اچھے تعلقات تھے لیکن اس بار تھانے میں رپٹ لکھوا دی کہ ان کے گھر کی دوسری منزل سے مرد ہمارے گھر جھانکتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے ان کی عورتیں شہر بھر میں تو گھومتی پھرتی ہیں۔"

عورت غور سے درزی کی بات سنتی رہی۔ گہرے سانولے رنگ کا گٹھے ہوئے جسم والا' کھڑے نین نقش' چمکدار سیاہ آنکھیں--- خوشحالی اس کے ہنس مکھ ہونے کا یقیناً ایک سبب ہوگی۔ وہ ایک پرکشش مرد تھا' پینتیس چالیس کا رہا ہوگا۔ سال بھر یہ دوبئی میں کیا کرتا ہوگا؟ بیوی تو ساتھ رہتی نہیں۔ پھر اس نے سوچا--- مگر آیائیں تو ہیں۔

درزی نے اسے بتایا تھا' "چھوٹا سا انتظام ہے دوبئی میں اپنا۔ خدا کے فضل سے سب کچھ ہے' فریج' ایئرکنڈیشنر۔ ایئرکنڈیشنر کے بغیر تو رہا نہیں جاتا نا' بڑی گرمی پڑتی ہے۔"

عورت نے آیا پر نظر ڈالی۔ اسے جوش ملیح آبادی کی نظم "تلنگن" یاد آئی۔ سنگ سیاہ میں تراشی ہوئی' تھامے طوفان سی جوانی' وغیرہ وغیرہ۔۔ مگر یہ تو وہ والی عورت نہ تھی' یہ دوسری طرح کی تلنگن --- دبلے بدن میں گھبراہٹ منجمد کئے' کمائی کے لیے (کن کے لیے کمائے؟ ماں باپ کے لیے؟ چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے؟ بچوں کے لیے) دور دیسوں کو جاتی ہوئی یوں اکڑی بیٹھی جیسے فوجی لام پر جاتا ہو۔

عورت درزی سے یہ نہ پوچھ سکی تھی کہ اس کے پڑوسی ہندو تھے یا مسلمان۔ بعد میں اس نے سوچا کہ پوچھ لیتی تو اچھا ہوتا' اس طرح کچھ نظریاتی کلیوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ اصول تھا کہ مخلوط معاشروں میں ایک فرقے کی معاشی ترقی سے فرقہ واریت کی کھیتی میں بیج پڑتے ہیں۔ اگر درزی کے پڑوسی ہندو تھے تب درزی کے مکان کی دوسری منزل انہیں بابری مسجد کا شدت سے مخالف بنا سکتی تھی۔

ہندوستان--- ہندوستان--- تقسیم کی دہائی تک' ایک غیر مختتم تسلسل--- مراد آباد--- میرٹھ--- بلووں کا طویل سلسلہ--- سنسان عیدگاہ کی مسلی' سلوٹیں پڑی دریوں پر خون کے دھبے--- دروازے پر عید کے لیے خریدے گئے نئے جوتوں کا ڈھیر--- ایک ننھا منا' کلابتو کا جوتا--- کوڑے کے ڈھیر کے پاس پڑی ایک چھوٹی سی سفید کڑھی ہوئی ٹوپی---

اور برسوں پہلے کراچی میں--- رنچھوڑ لائن کی تنگ' پیچ دار گلیوں میں سلوٹا پاڑے کے

دائیں جانب' جہاں سن سینتالیس اڑتالیس کا شاندار سنیما گھر لائٹ ہاؤس اپنی شفاف شیشے جڑی بلندی میں ہلکی دھوپ میں کھڑا جگمگا رہا تھا' چھ برس کا جلال ایک سہ منزلہ عمارت میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ کے نیچے دروازے پر کچھ خوفزدہ سا کھڑا حیرت سے ٹکٹکی باندھے برابر کی گلی کی طرف دیکھ رہا ہے جہاں ایک متروکہ مکان کا تالا توڑا گیا ہے اور سامان لوٹا جا رہا ہے۔

گلی میں شور ہے۔ چھین جھپٹ میں لوگوں کے بال بکھر گئے ہیں' دامنوں کے چاک ادھڑ گئے ہیں۔

"منے' اندر آ جاؤ!" بالکنی سے اس کی اماں پکاریں۔

"یہ--- یہ---" جلال چھوٹی سی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تتلا کر پوچھتا ہے۔ "یہ کا ہولہا ہے؟" (یہ کیا ہو رہا ہے)

"کچھ نہیں' سامان لوٹا جا رہا ہے--- تم اندر آ جاؤ---" اماں جلال کی بڑی بہن کو اسے اوپر لانے کے لیے بھیج کر باورچی خانے میں واپس چلی جاتی ہیں۔

لٹتے مکان کے سامان میں سے کسی ہندو بچے کی ایک چھوٹی سی گیند لڑھکتی ہوئی جلال کی گلی میں پہنچ جاتی ہے۔ ننھا جلال ڈرتے ڈرتے اسے اٹھاتا ہے پھر جب اس کا اعتماد بحال ہوتا ہے تو وہ اسے مضبوطی سے تھام لیتا ہے۔ گھر میں آ کر وہ اماں کو گیند دکھاتا ہے۔

"اماں' دیکھو! ہم نے بھی لوٹا!"

مگر وہ پڑوسی ہندو تھے یا مسلمان' عورت یہ پوچھ نہ پائی تھی۔ وہ جھجک کر رہ گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان تیلگو آیا بیٹھی تھی اور وہ اردو انگریزی بھلے ہی نہ سمجھتی ہو مگر لفظ "ہندو" تو ضرور سمجھ سکتی تھی۔ آیا کا لحاظ کرتے ہوئے وہ ایسا سوال نہ پوچھ سکتی تھی جس میں فرقہ واریت کا پہلو نکلتا ہو۔

تو کیا ہم اس قدر تکلف سے بیٹھے تھے؟ عورت بعد میں سوچتی ہے۔ شاید تکلف سے نہیں' تہذیب سے۔ سویرے کی پرواز میں جہاز کی نشستوں پر شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھے اپنا لحاظ سلامت لیے ہوا میں اڑے جاتے تین مسافر---

اور اگر--- عورت نے دوبئی میں دونوں ہندوستانی مسافروں کو وداع کرنے کے بعد تینوں نشستوں پر اکیلے قبضہ جماتے ہوئے' ہاتھوں کے انگوٹھے اوپر تلے گھماتے ہوئے' پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا تھا--- اگر وہ پڑوسی مسلمان ہوتے تب؟ تب کیا ثابت ہوتا؟

مگر یہ بات وہ معلوم کر ہی نہ سکی تھی۔ وہ کسی بھی کلیئے یا مسلمہ نظریئے میں ٹھیک نہیں

بیٹھ سکتے تھے اور عورت کے تخیل میں ہمیشہ یوں ہی پہلی بن کر رہنے والے تھے--- عمرانی معلومات فراہم کرنے سے انکاری' ایک کھڑکی سے جھانکتے' ہنس کر اس کو چڑاتے صرف کچھ حاسد پڑوسی' جو نہ جانے ہندو تھے کہ مسلمان!

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

ناظم آباد نمبر چار میں علیم الدین اور کلیم الدین کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ ان کے تحت الشعور میں بسے میں گورکھ پور سے ٹیکم چند نکل کر آوارد ہوا اور عجیب طرح کے اشارے کر کر کے کچھ پوچھنے لگا۔ تنگ آکر علیم الدین نے کہا۔ "نہیں بھائی ٹیکم چند' جداگانہ انتخابات کا مسلم لیگی مطالبہ کانگریس نے منظور نہیں کیا تھا۔ 1937ء میں موتی لال نہرو نے اسے مسترد کر دیا تھا۔"

نہرو--- جو کشمیر سے آئے تھے' صدیوں پہلے۔ مغل حاکموں نے انہیں نہر کے پاس جاگیر عطا کی تو وہ نہرو کہلائے۔

سب لوگ کہیں نہ کہیں سے آئے ہیں اور کوئی بھی کہیں کا ابدالاباد سے رہنے والا نہیں ہے۔

★ (انسانوں کے ہجوم گھوڑوں پر سوار' ہاتھیوں پر لدے' اونٹوں اور خچروں پر' ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں' صحرا اور سمندر الانگھتے جوق در جوق سفر میں ہیں اور ایک دوسرے سے جنگ و جدال میں مصروف ہیں--- رزق حاصل کرنے کے لیے' پیٹ میں دو نوالے روٹی ڈالنے کے لیے اور تن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو مکان حاصل کرنے کے لیے۔ علاوہ ازیں ٹیپ ریکارڈر اور ٹیلی ویژن' ایئر کنڈیشنر اور بجلی سے چلنے والا تمام اثرم کھٹرم سامان حاصل کرنے کے لیے انسانوں کے ہجوم بسوں اور ریل گاڑیوں میں' اونٹوں اور خچروں پر' چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور جہازوں میں' ایک مقام سے دوسرے مقام کی جانب سفر کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے جدال و قتال میں مصروف ہیں۔)

چنانچہ کلیم الدین گویا ہوا۔ "اوہ! تو پھر--- ایسا کیوں نہیں کیا جاتا--- کہ--- کہ بھئی' یہ ساری اشیاء جن دکانوں میں بھری ہیں ان کو--- کیا نام کہ لوٹ لیا جائے اور یہ سب چیزیں برابر برابر تقسیم کر دی جائیں لوگوں میں۔ بجائے ایک دوسرے کو قتل کرنے کے' میرے خیال میں تو یہ زیادہ بہتر طریقہ ہوگا۔"

"یعنی کرۂ ارض پر مکمل طوائف الملوکی قائم کر دی جائے؟" علیم الدین نے استفسار

کیا۔

"نہیں نہیں۔ اس کا باقاعدہ نظام بنایا جائے۔ ایک تو یہ کہ زندگی سادگی سے گزاری جائے۔ انسانی ضروریات کیا ہیں' اس کی از سر نو تفہیم کی جائے۔ مثلاً ایئر کنڈیشنر--- کیا یہ جائز انسانی ضرورت ہے؟"

"نہیں مگر جب بغیر ایئر کنڈیشنر والا ہجوم ایک طبقے کے کتوں کو بھی ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں آرام کرتا دیکھتا ہے تو وہ بھی یہی سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو امرا کو اور ان کے کتوں کو حاصل ہے۔

"یہ تو صحیح ہے۔ طبقات بڑی گڑبڑ چیز ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں طبقات ہونے کے باعث سب سے زیادہ بدامنی اور خونریزی ہوئی ہے۔ تو طبقات ختم کر دیئے جائیں!"

"ایسا ہوا تھا نا پیارے! سوویت یونین اور چین میں ایک اشتراکی معاشرہ قائم کیا گیا تھا نا! مگر یہ بیسویں صدی کا آخر ہے۔ دنیا نے سوشلزم کو مسترد کر دیا ہے۔

"وہ تو اس لیے کہ آزادی نہیں تھی--- ضرورت سے زیادہ نوکر شاہی آگئی تھی اس نظام میں---"

"جی نہیں! اس لیے کہ اشتراکی ملکوں کے عوام اپنے اشتراکی قومی ملکیت کے کارخانوں میں بنے بھدے کیمروں اور ناقص کلائی کی گھڑیوں سے نفرت کرتے تھے۔ اس کے بجائے وہ خوبصورت اور اعلیٰ تر جاپانی کیمرے اور گھڑیاں خریدنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ سوئس چاکلیٹ کھانا چاہتے تھے۔"

"آہ! صرف ان چیزوں کے لیے!" سننے والے نے کہا۔

"ہاں!" کہنے والے نے سنایا اور چند ردی کاغذ ہوا میں اچھالے۔ "وہ گیا اشتراکی نظام--- صرف ایک سوئس چاکلیٹ کے لیے!"

تو آدمی تو ایسا ہے!

ایسا ہے بھئی ایسا ہے!

علیم الدین رضوی اور کلیم الدین رضوی' سکنہ ناظم آباد نمبر چار' نے قوالی گائی اور دھمال ڈالا۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

برسوں پہلے کی بات ہے' کراچی میں ناگن چورنگی کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم اچانک رک گئے۔ چورنگی پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مائیکروفون تھا اور وہ کچھ تقریر سی کر رہا تھا۔ آس پاس سے گاڑیاں تو بغیر اس پر توجہ دیئے گزر رہی تھیں مگر چند پیدل چلنے والے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ وہ آدمی کہہ رہا تھا۔

"بھائیو اور بہنو! سندھیو اور مہاجرو! پنجابی' پٹھان' بلوچو! چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہنے والو! بسوں میں سفر کرنے والو! ہمارے خواب کہاں کھو گئے؟"

کہاں کھو گئے ہمارے سنہرے سپنے ہمارے وطن' پاکستان کے سپنے جو ہماری آنکھوں کو سجائے رکھتے تھے۔ آدرش جن کی طاقت سے ہم پہروں بس اسٹاپ پر دھوپ میں کھڑے رہ سکتے تھے۔ اس دولت مند طبقے نے وہ خواب ہم سے چھین لئے۔ یہ لوگ اتنے مفلس تھے کہ انہوں نے مفلسوں کے خواب چرا لیے۔ ثروت اور عیاشی میں محصور یہ لوگ ہمارے خوابوں کے جھوٹے دعویدار بن چکے ہیں۔ یہ جیٹ سیٹر جنیوا اور نیویارک میں ہمارے خوابوں کا ناٹک رچا رہے ہیں۔ یہ انسانی حقوق کی انجمنیں بناتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا طرز زندگی اس سیر زمین پر سب سے گھناؤنا منظر ہے اور اس بدصورتی کو مٹا ڈالنا یہاں کے انسانوں کا جائز حق ہے۔

"اس طبقے کی عورتیں عورتوں کے حقوق کی انجمنیں بناتی ہیں اور ایک لاکھ روپے کا جوڑا پہن کر نو لاکھ روپے کی موٹر گاڑی میں بیٹھ کر ایک کروڑ روپے کی شادی کی تقریب میں شرکت کرتی ہیں اور تمہاری بیٹیوں کے معمولی جہیز پولیس اور رینجرز کے افراد گھروں میں گھس کر چھین لے جاتے ہیں۔"

"اس امیر طبقے نے ہمارے خواب چرا لیے اور ان کے بدلے میں اپنے خواب ہماری آنکھوں کے پپوٹوں میں کسی زہریلے انجکشن کی طرح داخل کر دیئے--- تمول اور ثروت کے--- عیاشی کے خواب۔ اب ہم وہی خواب دیکھ رہے ہیں اور ہاتھوں میں بندوقیں لیے ایک دوسرے پر فائر کر رہے ہیں' ایک دوسرے کی کھوپڑیاں پاش پاش کر رہے ہیں۔

"قومی حقوق! قومی حقوق کیا ہیں؟ روٹی کپڑا اور مکان--- یہی تو چاہیئے انسان کو! اب اس کے ساتھ کار اور ایئر کنڈیشنر اور بجلی سے چلنے والا جدید ترین سامان بھی شامل ہو چکا ہے۔ اسی لیے تو لڑ رہے ہیں ہم۔ جتھے اور گلے بنا بنا کر ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔"

اور امیر طبقہ اپنے سارے ظاہری واویلا کے باوجود اس سے خوش ہے۔ وہ یہ صورتحال

برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

(" ہمیں قومی حقوق کے ساتھ اپنے چرا لیے گئے خواب کی ضرورت ہے۔ اس دنیا کی جو ہماری تھی اور جو برباد کر دی گئی۔ اتنی بری تو نہ تھی ہماری چھوٹی سی دنیا۔ اس میں ایک پیڑ تھا اور ایک مختصر آنگن پر پھیلا ہوا بسیط نیلا آسمان۔ ٹھنڈے پانی کی صراحی اور اس پر ڈھکا کٹورا۔ اس میں کتابیں تھیں اور علم کی پیاس تھی اور ایک پرانی جائے نماز جس پر ہماری ماں یا باپ بغیر خونخوار نعرے لگائے عبادت کر سکتے تھے اور جوان لڑکیاں اور لڑکے جو سیاہ عبائیں پہنے بغیر الف لیلہ کی رقاصاؤں کی طرح آنکھوں سے نیچے تک نقابیں اوڑھے بغیر' چغے پہنے بغیر اور سروں پر مسخروں کے سے رنگ برنگے عمامے باندھے بغیر رہتے تھے اور خدا کی قسم کھانے سے جھجکتے تھے۔)

ہمیں اپنی جھجک کی بازیافت کی ضرورت ہے جو ہم سے چھین لی گئی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں بندوقیں تھما دی گئی ہیں اور اس قتل و غارت گری کو تقدس بخشنے کے لیے ہمارے شہروں کی شاہراہوں پر جا بجا اللہ اکبر اور ھوالصمد کے سبز بورڈ آویزاں کر دیئے گئے ہیں---

وہ یہاں تک کہہ پایا تھا کہ ہجوم سے ایک غلغلہ اٹھا۔

"بور--- بور--- بورا مارو! نکالو اسے!"

ہجوم اس پر سڑے ہوئے ٹماٹر اور گندے انڈے برسا کر تتر بتر ہو گیا۔

اب اس شخص نے پینترا بدل کر دوبارہ تقریر شروع کی۔ اس نے مکالمہ کر کہا۔

"مہاجروں کے حقوق کے لیے ہم خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے!"

ہجوم سرعت سے جمع ہو گیا اور تالیوں کا ایسا شور بلند ہوا کہ آس پاس کی عمارتیں لرزنے لگیں۔

پھر اس نے لہجہ بدل کر کہا۔

"ہم سندھیوں کے حقوق کے لیے آخری سانس تک جنگ کریں گے۔"

حیدر آباد اور سکھر اور نواب شاہ اور پورے سندھ سے نعروں کا ایسا شور اٹھا کہ دھرتی دھمکنے لگی۔

"مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں!"

وہ آدمی سندھیوں اور مہاجروں کا رہنما بن گیا۔

◆ ◇ ◆ ◇ ◆

کراچی کے شہری

پہلے لوگوں نے ایک سنسنی محسوس کی۔
پھر وہ مزید قتلوں کا انتظار کرنے لگے۔
اس کے بعد مزید قتل ہوئے۔ یہ سب قتل متوقع تھے۔
کراچی میں لوگ دو تین برس سے ایک بڑے قتل عام کی توقع کر رہے ہیں--- حالانکہ بیچ میں لوگ اپنی توقع بھول جاتے ہیں۔
کبھی انہیں لگتا ہے کہ قتل کی خبروں کا اب ان پر اثر نہیں ہو رہا۔ وہ کثیرالتعداد قتل کی وارداتوں پر مذاق بنانے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آج کا اسکور پوچھتے ہیں۔
ان میں سے چند کہتے ہیں۔ "قتل اور جرائم تو ہر شہر میں ہوتے ہیں۔"
"بڑے شہروں میں قتل اور جرائم زیادہ ہوتے ہیں۔"
"شکاگو میں بہت قتل اور جرائم ہوتے ہیں۔"
"کراچی کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔"
"یہاں کوئی تفریحی مقام نہیں۔" (اس لیے لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں؟)
"اگر سڑکوں کی مرمت ہو جائے، اگر سیوریج سسٹم ٹھیک ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

پیاز کے چھلکے

سال بھر سے ریاست کے دارالخلافے میں ایک افواہ گشت کر رہی تھی (گو یہ بات بڑی رازداری سے کہی جاتی تھی) کہ بااختیار قوتوں نے کراچی کے مسئلے کو حل کرنے کا ایک منصوبہ بنا لیا ہے۔ منصوبہ یہ تھا کہ چونکہ کراچی کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور گنجلک ہے اور اسے حل کرنا صوبائی انتظامیہ کے بس کی بات نہیں، لہٰذا مختصر پیمانے پر تھوڑے بہت خون خرابے کے بعد کراچی کو وفاقی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ (دوسری صورت میں--- کہا گیا تھا--- بہت بڑے پیمانے پر خون خرابے کا خطرہ تھا۔) اس منصوبے کا کیا ہوا؟ کیا یہ چاروں طرف گرتی لاشیں--- چھ سات، چار پانچ، دو تین، ہر روز اور کبھی زیادہ--- اسی منصوبے کی تکمیل کا حصہ ہیں؟ جیسی پرت در پرت، منصوبے کی پیاز کے چھلکے اترتے ہوں--- یا یہ منصوبہ مناسب نہ سمجھتے ہوئے بیچ ہی میں چھوڑ دیا گیا؟ یا یہ محض افواہ تھی، ایسا کوئی منصوبہ بنایا ہی نہیں گیا تھا؟

کراچی کے شہری یہ نہیں جانتے، صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح معلومات حاصل کرنے کا ان کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ مسائل کے حل کی حکمت عملی خفیہ ہے۔ ایسے مضبوط صندوقوں میں بند، آر پار نظر آنا جن کی خصوصیت نہیں--- وہ اندھیرے میں ہیں اور صرف امید کر سکتے ہیں کہ بااختیار ہاتھ کی حکمت عملی درست ہوگی، تیر (اب کی بار) نشانے پر بیٹھے گا اور پھر--- شاید سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس منصوبے کی افواہ جب کراچی میں پھیلی تھی تو سننے والوں نے اطمینان تک محسوس کیا تھا۔ وہ ایک ناٹک کی طرح کھیلے جانے والے خون خرابے کو، جو خفیہ ہاتھوں کے قابو میں ہو،

قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے تھے مگر ذہنی طور پر تیار ہونا ایک بات ہے' سچ مچ کسی صورتحال سے گزرنا بالکل دوسری بات۔ اب جبکہ خون بہنا شروع ہو گیا تھا (اگر یہ اس مجوزہ یا مبینہ ناٹک کا حصہ تھا!) تو وہ بلبلا رہے تھے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خونریزی ان کا' ملک کا' قوم کا' کراچی کا بھلا چاہنے والوں کے (انہیں اتنا چاہنے والوں کے جتنا کوئی بھی نہیں چاہتا ہو گا) بہ قائمی ہوش و حواس بنائے ہوئے کسی ایسے منصوبے کا حصہ شاید نہیں ہو سکتی جس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کیا شہر کے لوگ اپنے حالات خود ٹھیک نہیں کر سکتے؟

لیکن اس کا جواب ایک اور حکمت عملی میں ہے' سن 1977ء سے جاری و ساری اور سختی سے نافذ حکمت عملی جس کے ذریعے سے منظم طور پر عام لوگوں کو سیاسی عمل سے اور معاشرے کو کوئی بھی رخ دینے کی قوت سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ دہشت ناک فوجی حکومت کے طویل' اعصاب شکن برسوں نے لوگوں کو' بحیثیت ہوش مند شہری' معطل کر دیا ہے۔ ایک سطح پر' انجانے میں' کسی مقام پر وہ اپنی صلاحیتوں سے دستبردار بھی ہو گئے ہیں۔ فوجی آمریت میں جلاوطن ہو جانے والے لوگوں نے پاکستان واپس آ کر ہاتھ پر ہاتھ دھری ایسی مخلوق کو دیکھا تھا جس کی آنکھیں برسوں صرف وی سی آر اور ٹیلی ویژن دیکھتے دیکھتے چوکور ہو چکی تھیں اور جو صوفوں پر' کرسیوں پر' چٹائیوں پر دراز یہی کہہ رہی تھی کہ کچھ کروایا جا رہا ہے' کچھ کروایا جانے والا ہے اور اپنی انتہائے مفعولیت کی حالت سے بے خبر تھی۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

معیشت

اس شہر میں' میں اجنبی یوں تو نہ تھی میرے خدا
اس کی زمیں؛ اس کے فلک' اس کی ہوا کو کیا ہوا؟
پہچان میں آتا نہیں' پہچان بھی پاتا نہیں مجھ کو کوئی
بدلا ہوا نارا سماں
ہے روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
گھر تھے یہاں
رہتے تھے جن میں کچھ مکیں
اک پیڑ تھا اس جا کھڑا
جھولا پڑا تھا ڈال پر
اک دوست رہتا تھا یہاں
کیوں مٹ گئے سارے نشاں؟
اب تو فقط ہر موڑ پر' ہر گام پر
بازار ہے' بازار ہے' بازار ہے

بازار میں ہر روز عید
سستی فروخت' فوری خرید
میلے دکاں داروں کے ہیں

کیا شور ہر کاروں کے ہیں
اشیا کا جوبن ہے عیاں
چھڑکاؤ ان کے صحن میں، خوشبو لٹاتا موگرا
پھر شور اٹھانا گہاں
لو لڑ پڑے گاہک نئے
خنجر چھری پستول نکلے، بم پھٹا، پھیلا دھواں
دوڑا پولیس کا آدمی، سیٹی بجی
بازار کے اوپر تنا ہے آسماں نیلم جڑا
ابھری سمندر سے ہوا، نکلا ہے تارا شام کا
اور چاند ہے پیلا پڑا
بازار کے اندر مگر فرصت کسے، دیکھے ادھر
ساگر کے تٹ تک چھا گیا، سانسوں کی حد تک آ گیا
جو ہر طرف بازار ہے
بازار ہے، بازار ہے

(1987ء میں جلاوطنی سے لوٹنے کے بعد، کراچی میں کہی ایک نظم)

ارے احمق! بازار کو تم برا سمجھتی ہو؟ تم مارکٹ اکانومی اور اس کی قوتوں کو کم کر دانتی ہو؟ دراصل تمہیں معیشت کی سمجھ ہی نہیں تھی۔ بازار جتنا پھیلے، لوگوں کو اتنا زیادہ روزگار ملتا ہے۔ کیا کہا، سادہ زندگی؟ آدمی ایک تو سادہ زندگی چاہتا بھی نہیں، دوسرے سادہ زندگی سے تو معیشت منجمد ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر (بی بی سی اکنامک رپورٹ برائے چین) اگر ایک محلے کے لوگ ایک انڈا روز کھاتے ہیں تو اصراف کے لیے تین ہزار پانچ سو پندرہ مرغیاں پال لی جاتی ہیں۔ انہیں فوراً دو انڈے روز کھانے شروع کر دینے چاہئیں، جس کے لیے سات ہزار تیس مرغیوں کی ضرورت ہوگی۔ اس سے ان کو دانہ کھلانے والوں کی آمدنی دگنی ہو جائے گی، علاوہ ازیں مرغیوں کی دیکھ بھال کرنے والوں، انڈے جمع کرنے والوں اور مرغی خانے صاف کرنے والوں کی تعداد بھی دگنی ہو جائے گی۔ یعنی روزگار میں اضافہ ہوگا۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

شہر (1)

اب یہ جہاز لندن ہی جا کر رکے گا، عورت سوچتی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر بتی بند کرتی ہے اور ہوائی میزبان کا دیا ہوا کمبل اوڑھ کر، تینوں نشستوں کے ہتھے اٹھا کر، ننھا سا تکیہ لگا کر آرام سے سونے کے لیے لیٹ جاتی ہے۔

بہت ہی دور رہ گیا کراچی۔ اس کے دماغ میں شہر کی تصویر گھومتی ہے۔

شہر جو بحیرۂ عرب کے کنارے لیٹا ہے، نقشے میں دیکھنے پر اس کی شکل ایک مچھلی کی دم کی طرح دکھائی دیتی ہے جبکہ باقی مچھلی پانی میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اس منقسم دم کا شمالی حصہ لسبیلہ سے متصل کیرتھر پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ باریک ہوتا ہوا ختم ہوتا ہے جبکہ جنوبی حصہ سندھ کے میدانی علاقے میں گولائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح کراچی میدانی، زرخیز سندھ اور کوہستانی، سنگلاخ بلوچستان کے درمیان دھوپ میں لیٹا ہے، جنوب مغرب میں عرب ساگر کی نرم لہروں کی تھپکیوں میں ہلکورے لیتا، اپنے بادلوں بھرے ساحلی آسمان کے نیچے، نمکین، گیلی ہوا سے سدا ٹھنڈا اور کچھ چپ چپا۔ یہاں آپ کا پسینہ آسانی سے نہیں سوکھے گا اور اگر آپ کے بال لمبے ہیں تو وہ اس کی گیلی ہوا کے پہلے ہی جھونکے میں گھنگھریالے ہو جائیں گے اور نمکین دھوپ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی جلد کی رنگت سنولا دے گی۔

یہاں کا پانی ہر ایک کو راس نہیں آتا۔ 1958ء میں ملک میں مارشل لاء لگانے کے بعد جب فیلڈ مارشل ایوب خاں یہاں آئے تو ان کا ہاضمہ مستقل طور پر خراب رہنے لگا۔ ملک کے دارالخلافے کو اس سمندری، گرم و مرطوب علاقے سے (اور یہاں آ بسنے والے دبلے پتلے، سانولے، تیزی سے چر چر چر بہت زیادہ بولنے والوں کے شور مچاتے جنگل سے) نکال کر

دور شمال میں اپنے گاؤں ریحانہ کے پاس بسانے میں فیلڈ مارشل ایوب خاں کی بد ہضمی کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔

(یہ بات راقم الحروف کو 1962ء یا 63ء میں ایوب خاں کی اس وقت نو عمر صاحبزادی نے ان کے پر سکون گاؤں ریحانہ کی آبائی رہائش گاہ میں بتائی تھی۔ راقمہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ مری اور ایبٹ آباد کی سیر و سیاحت کو گئی تھی۔ ساتھ پڑھنے والی ایک لڑکی ایوب خاں کی صاحبزادی کی دوست تھی۔)

بڑی طاقتوں کی میزوں پر دھرے نقشوں میں یہ عمان کھاڑی کے دہانے پر نیلے پانیوں کے پار اپنے عین سامنے جڑواں شہر مسقط کو تاکتا اور ہاتھ ہلاتا نظر آ سکتا ہے' گرم پانیوں کے دہانے پر جہاں سے تیل کی دولت سے مالا مال شرق اوسط کے وسائل تک رسائی سہل اور کم خرچ ہے اور خوشحال پھلتے پھولتے بازار' زیادہ سے زیادہ چیزوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت دینے کے اہل صارفین کی زیادہ سے زیادہ اور روز افزوں تعداد۔۔۔

اردو میں کٹ کٹ بولنے اور بولتے ہی رہنے والے مہاجرین (جیسا کہ بہت سے دوسری زبان بولنے والوں کو شکایت ہے) 1947ء میں جس شہر میں پہنچے وہ ایک خوبصورت' صاف ستھری اور مختصر بندرگاہ تھا' گو اس وقت بھی یہ اپنی ماہیئت میں وسیع المشرب تھا۔ یہاں ایران سے ہجرت کر کے سورت کی بندرگاہ پر اترنے اور پھر کراچی میں آ کر بس جانے والے پارسیوں اور بہائیوں کی کالونیاں آباد تھیں۔ بوہروں اور خوجوں کے محلے تھے' پرتگالی اثر و نفوذ میں عیسائیت اختیار کرنے والے رومن کیتھولک گوانیوں کی بستیاں تھیں جن کے بنائے ہوئے چرچ جا بجا ایستادہ ہیں۔ (پاکستان کا سب سے بڑا رومن کیتھولک چرچ کراچی میں ہے۔ اس کے برعکس' برطانوی راج کے زیر اثر عیسائی بننے والے پروٹسٹنٹ' عموماً پنجابی خاکروبوں کا چرچ' گو تعمیر میں شاندار ہے مگر اس کے ممبروں کی تعداد کراچی کے قدیم تر رومن کیتھولکوں سے کم ہے۔ سفید پوش روزگار کمانے والے ان کیتھولکوں کا ایک خفیہ چٹکلا یہ ہے کہ کراچی کے امریکی اور برطانوی سفارت کار تیج تیوہار کے موقع پر "بھنگی چرچ" میں عبادت کرتے ہیں۔)

شہر کی پرانی گلیوں میں کھارادر کے آس پاس جینا ذات کے ناموں کی اکا دکا تختیاں آج بھی کہیں نظر آ سکتی ہیں (وہی ذات جو محمد علی نامی ایک عظیم سیاستداں کے ساتھ منسلک ہو کر مشرف بہ اسلام کئے جانے پر' یا اردوائے جانے پر' حائے حطی سے لکھی گئی اور جناح بنی' مگر

جسے اس نو مسلم' اپنی اصل میں گجراتی ذات کے دوسرے افراد نے نہ اپنایا ورنہ آج کتنے جناح گھومتے پھرتے! کیا آپ کو کبھی تعجب نہیں ہوا کہ برصغیر میں جناح ذات کا کوئی دوسرا بندہ بشر کیوں نہیں؟)

انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی قبضے میں آنے کے بعد بھی اس شہر کا کثیر قومی اور کثیر تہذیبی مزاج برقرار ہی رہا تھا جس میں یہاں رہنے والی ہندو آبادی اور اس سے تعداد میں بہت کم مسلم آبادی (جو یوں بھی اندرون سندھ کے علاوہ دوسرے ملحقہ علاقوں' کچھ گجرات یا سوراشٹر سے آئی ہوئی تھی) کہیں جذب تھی۔ اسی لیے یہ شہر صرف سندھ کے دوسرے شہروں ہی سے نہیں بلکہ اس پورے خطے سے قطعی مختلف تھا جسے اب مغربی پاکستان کہا جا رہا تھا اور اپنی ماہیت اور خمیر میں بحیرۂ عرب کے اس کٹے پھٹے ساحل پر ذرا نیچے اتر کر آباد عروس البلاد بمبئی سے زیادہ مماثل تھا۔

مگر 1947ء کے آس پاس مذہبی فرقے کا شعور بڑھنے کے باعث (جیسا کہ پورے برصغیر میں کہیں کم کہیں زیادہ جلد اور کہیں جلد' کہیں بدیر ارتقا پا رہا تھا) سندھ میں بھی مسلمان اپنی مذہبی حیثیت پر اصرار کرنا شروع کر رہے تھے۔ سندھ کے بمبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ اس شہر میں بتدریج رہائش اختیار کر رہے تھے۔ پچاس کے قریب برسوں میں ایک میگا پولس بن جانے والے اس شہر کی آبادی 1941ء کی مردم شماری کے مطابق چار لاکھ نفوس کے لگ بھگ تھی۔ 1951ء میں یہ آبادی گیارہ لاکھ ہو چکی تھی۔ قدیم آبادی سے بھی دگنی تعداد میں یہاں آ کر بسے مہاجروں نے اس شہر کو پلک جھپکتے میں ایک مہاجر شہر بنا دیا تھا۔ ان میں بھاری تعداد اردو بولنے والوں کی تھی جو مہاجر کیمپوں سے نکل نکل کر شہر بھر میں پھیل رہے تھے' جن سے بن پڑا متروکہ مکانوں کے تالے توڑ کر ان پر قبضے کر رہے تھے یا جھگیوں جھونپڑیوں میں رہ رہے تھے۔ پچاس کی دہائی تک کراچی میں آپ کو جا بجا جھگیوں جھونپڑیوں سے پٹے میدان نظر آ سکتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی تک یہ لوگ مکانوں' فلیٹوں میں منتقل ہو چکے تھے۔

دنیا بھر میں ہجرت کرنے والے گروہوں کی طرح' جو پرانے طور طریق' معاشرے اور عادات کی زنجیریں توڑ چکے ہوتے ہیں۔ یہ جم غفیر بھی اس سرزمین پر' یہاں کے قدیم بسنے والوں' پرانے طور طریق' عادات اور اقدار میں ہنوز بندھے باسیوں سے کہیں بڑھ کر' بہتر سے بہتر روزگار اور زندگی کے وسائل حاصل کرنے کی جدوجہد میں جتا ہوا تھا۔ یہ لوگ بات بے بات "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے' ایک ایسے ملک کے باسی تھے جو نصف زمین پر

اور نصف ان کے اپنے ذہن میں تھا۔

آنے والے برسوں میں اس نئے اپنائے ہوئے وطن کی طبعی حقیقت (مع اپنے باشندوں کے) ان کے تصوراتی وطن سے ٹکرانے والی ہے۔

فی الحال تو وہ مسلم لیگ میں ہیں اور قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں فضا میں مکا بلند کر رہے ہیں اور مہاجرین کے جم غفیر پاکستان زندہ باد کے پرشور نعرے لگا رہے ہیں۔

آنے والے چند برسوں میں ہجرت کر کے آنے والے ہیولے جیسے انبوہ کے خط و خال نمودار ہونا شروع ہو جائیں گے' جیسے وقت کی ریگ پر تصویر کے نین نقش ابھرتے ہیں۔ ان میں ایک ریوڑ کے بدلے افراد' گروہوں اور طبقوں کے نقوش قابل شناخت بننے لگیں گے۔ یہاں سے اردو کے دو بڑے اخبار "جنگ" اور "انجام" نکلیں گے۔ انگریزی کا اخبار "ڈان" جم جائے گا اور انگریزی مجلّہ "مرر" نکلے گا۔ ہفتہ وار "نمکدان" اپنے قہقہہ آور کارٹونوں سمیت خودغرض سیاست دانوں کے پرخچے اڑائے گا۔ یہاں کا پریس مختلف آرا کا ترجمان ہو گا۔ اس شہر کے کسی کوچے میں ابراہیم جلیس پبلک سیفٹی ایکٹ کی مخالفت میں "پبلک سیفٹی ریزر" لکھیں گے اور حسن ناصر مزدوروں کو منظم کرنے کی تحریک کا آغاز کریں گے۔ اونچے تعلیمی اداروں میں ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن مضبوطی سے جڑیں پکڑے گی۔ یہاں مختلف سیاسی رجحانات ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور تصادم کا شور اٹھے گا' جیسا کہ دنیا بھر کی سیاست میں ہوتا ہے۔ دور' شمالی ہندوستان کے ہرے بھرے میدانی علاقوں سے آئے ہوئے یہ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے صحنچوں میں' گھروں میں اور گھروں کے باہر ہر میسر بیج اور پنیری بوئیں گے اور دور دور تک خالی پڑے چٹیل' غیر آباد ریتیلے علاقوں میں کسی آنے والے زمانے کی ہریالی کا انتظام کریں گے۔

یہاں بنیں گے دھڑا دھڑ اسکول اور کالج۔ ہجرت کر کے آنے والی اس شہری آبادی کے سامنے آگے بڑھنے کا صرف ایک راستہ ہے... تعلیم' حتیٰ کہ گجرات میں جنما ایک مزدور' اے ایم قریشی کراچی آ کر دولت کمانے کے لیے اسکول اور کالج ہی بنائے گا' جبکہ اس کا حیرت انگیز طور پر مماثل ہمزاد' حاجی مستان' بمبئی میں نام اور پیسہ کمانے کے لیے اسمگلنگ کرتا رہے گا... ہجرت کا ایک تحیر خیز مثبت پہلو!

1958ء میں ملک میں مارشل لاء نافذ کرنے کے بعد دراز قد سرخ و سفید سربراہ مملکت جنرل ایوب خاں دارالسلطنت کو کراچی سے اپنے گاؤں ریحانہ کے نزدیک لے گئے۔ انہیں

کراچی اور کراچی کے باشندے کچھ خاص پسند نہ تھے۔ کلبلاتی آبادی کے روزافزوں شور شرابوں اور مطالبوں سے اکتا کر انہوں نے کہا تھا کہ اگر انہیں حکومت پسند نہیں تو جہاں چاہیں چلے جائیں' آگے تو سمندر ہے۔ (ان کے منہ سے نکلا یہ جملہ آناً فاناً مشہور ہو گیا تھا اور آج تک اتنا مشہور ہے کہ وقتاً فوقتاً مہاجروں کے مسئلے سے تنگ آنے والے مذاق میں' طنزیں... اور کبھی سچ مچ... انہیں سمندر کا رخ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔) کچھ برس بعد جب ایوب خاں نئی مسلم لیگ بنائیں گے جو درحقیقت ان کی ذاتی مسلم لیگ ہو گی تو کراچی کے باسی اس میں شامل نہ ہوں گے۔

مگر اس دور میں' جبکہ ان کے شہر میں صنعت کاری کا سلسلہ عروج پر ہے' ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے روزگار کی تلاش میں آنے والوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور ان کے ساتھ گنجان آباد پنجاب سے روزگار کاروبار کے لیے نت نئے مواقع ڈھونڈتے لوگ ایک موٹی دھارا کی مانند انسانوں کے اس سمندر میں گر رہے ہیں۔

شہر' حجم میں اضافہ کرتا ہوا' کسی نامیاتی اکائی کی طرح اپنے ہی ریشوں کی افزائشی قوت سے نئے عضلات پیدا کرتا' ان کی نشوونما کرتا' اپنے ہی زور میں کسمساتا' پیچھے ہی پیچھے سرکتا جاتا شہر... جیسے سمندر میں نصف دھڑ غرق کئے نمکین پانی پیتی مچھلی دھیرے دھیرے سرک کر باہر نکل رہی ہو جس کی پشت پر لوگ سندباد جہازی کی مانند کسی دور چلے جانے والے جہاز سے اتر پڑے ہوں۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

مسئلے کے پیٹ میں

اندرون سندھ سے سندھی کراچی میں پہلی بار ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں آئے--- کلرکوں اور نائب قاصدوں کے کئی گروہ جو سستی آبادیوں میں کم کرائے پر ملنے والے فلیٹوں اور کوارٹروں میں رہنے لگے تھے۔ ان کے گول سروں اور گھنگھریالے بالوں والے چہرے اشتیاق سے چمکتے تھے۔ وہ جوش و خروش سے ہمارا کراچی کہنے لگے تھے۔ ماضی میں حکمرانوں اور حکمراں طبقوں نے سابق مشرقی پاکستان کی عددی برتری ختم کرنے کے لیے ملک میں "ون یونٹ" نامی جو نظام نافذ کیا تھا' جس نے تمام خطوں کی صوبائی حیثیت ختم کر دی تھی' اسے توڑنے کی طویل تحریک کے دوران سندھی قومیت کا شعور پروان چڑھ چکا تھا۔ اس جدید سندھی تصور میں جو سندھ تھا اس میں کراچی بھی شامل تھا۔ یہ ایک ٹھوس جغرافیائی حقیقت بھی تھی' سندھ کے باقی زرخیز میدانی علاقے سے منسلک یہ جغرافیائی لحاظ سے سندھ ہی کا حصہ تھا۔ برطانوی راج میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے اسے سندھ کا دارالحکومت بنانے کے لیے سندھیوں نے منظم اور کامیاب تحریک چلائی تھی مگر پاکستان بننے کے بعد سندھی آبادی کراچی میں گزر نہ کر پائی تھی۔ ون یونٹ کے نظام میں سرکاری ملازمتوں پر پاکستان بھر کے ملازم بھیجے جاتے رہے تھے۔

1972ء میں جب ایک نیا دور شروع ہوا تھا تو سندھیوں کے داخلے کا بھی آغاز ہو رہا تھا' مگر یہاں آکر وہ خود کو غیر سندھیوں کے سمندر میں پا رہے تھے۔ (ان کا سندھ کا تصور کراچی کی طبیعی حقیقت سے ٹکرا رہا تھا' وقت کے ہاتھ نے جس کو ماضی سے قطعی مختلف بنا دیا تھا۔) اسی لیے ان کو گہرا نہیں مگر ایک اتھلا سا یقین تھا کہ کراچی سندھ کا حصہ ہے کہ کراچی پر ان کا

بھی حق ہے اور اسی طرح کے چند ایک اور یقین---

اتفاق سے راقم الحروف کا انہی دنوں اس طبقے میں کافی اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان میں سے ایک ضلع کنڈیارو سے آیا تھا۔ اسے ایک پرائمری اسکول میں سندھی ٹیچر کی ملازمت ملی تھی لیکن اس نے اپنے تئیں ہمیشہ ایک ادیب ہی تصور کیا تھا۔ وہ ہر وقت بغل میں پروگریسو پبلشرز کے ہاں نہایت سستی ملنے والی ٹالسٹائی' دستوئفسکی یا گورکی کی کوئی کتاب دبائے گھومتا تھا اور گو کہ وہ سندھی قوم پرست تھا جیسا کہ اس کی نسل کے فیشن کا تقاضا تھا' درحقیقت وہ خود کو روسی محسوس کرتا تھا اور روس جا کر رہنا چاہتا تھا۔ اپنے جیسے دوسرے کئی چھڑوں کے ساتھ وہ لیاقت آباد اور ناظم آباد کے درمیان سندھی کلرکوں سے آباد کئی منزلہ گمنام سی عمارت میں رہتا تھا۔

ایک دفعہ میں نے ان لوگوں سے پوچھا تھا۔ "بھئی' آپ لوگ گھر والوں کو کیوں نہیں بلا لیتے؟ باقاعدہ گھر بسا کر کیوں نہیں رہتے؟"

اس پر انہوں نے معصوم اور بشاش قہقہہ لگایا تھا (جیسا کہ دیہات سے نئے نئے آنے والے سندھی کلرک لگاتے ہیں) پھر ایک دوسرے کو چور نظروں سے تاکتے ہوئے کہا تھا۔

"اوے ادھر کا بھروسہ ہی کیا۔ ابھی کل کو بھٹو کی حکومت چلی جائے تو ہم سب کان لپیٹے وری گوٹھ جا رہے ہوں گے۔"

(اور ہوا بھی یہی۔ بھٹو حکومت کے خلاف 1977ء کی پی این اے کی تحریک کے دوران سندھی کلرکوں کے فلیٹ کے نیچے رات رات بھر ڈھول بجائے جانے لگے۔ دو تین راتوں تک انہوں نے شہر کے خالی کر دینے کے اس صوتی مطالبے کی تھاپ سنی' پھر کان لپیٹ کر وری گوٹھ چلے گئے۔)

یا پھر کراچی میں وڈیرے آئے تھے ایک گورنر یا وزیراعلیٰ اور چند وزراء' ڈبل گھوڑا بوسکی کی لس لساتی شلواروں اور قمیصوں میں ملبوس' گلوں میں سونے کی زنجیریں ڈالے اور سونے کی انگوٹھیاں پہنے وہ اپنے باورچیوں اور نوکروں اور مصاحبوں کی پلٹنوں سمیت کراچی میں وارد ہوئے تھے اور قیمتی کاروں میں دندناتے پھرتے تھے۔ وہ دھڑا دھڑ اشتیاق سے مہاجر عورتوں سے شادیاں کرتے اور معاشقے لڑاتے' اونچی آوازوں میں شہوت بھرے قہقہے لگاتے' گفتگو کرتے ہوئے اپنی موٹی موٹی مونچھوں پر تاؤ دیتے اور اپنا بدن سہلاتے رہتے۔ ان کے مصاحب اور نوکر بھی اپنے شاہ سائیں کی شاہی کے نشے میں مست تھے۔

پی این اے کی تحریک کے دوران جس کا رخ حیرت خیز طور پر آغاز ہی سے سندھی مخالف بن گیا تھا' میں نے چند مہاجر نوجوانوں سے سندھیوں کی مخالفت کا سبب پوچھا تھا۔ مختلف نجی اداروں' اخباروں اور چھوٹی موٹی دکانوں میں کام کرنے والے' موٹر سائیکلوں پر پورے خاندان کو بٹھا کر سفر کرنے والے ان محنتی' ہوشیار متوسط طبقے کے نوجوانوں نے سندھیوں کا وہی حلیہ بتایا تھا جو اوپر وڈیروں کا تحریر ہے۔

مہاجر متوسط طبقے کو وہ صرف سندھی نظر آتے تھے' "سندھی وڈیرے" نظر نہیں آتے تھے۔ یہ نوجوان کراچی میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے' انہیں بالکل علم نہ تھا کہ ان کے اپنے آبائی وطن کے جاگیردار اور نوابین بھی بالکل اسی حلئے اور انہی عادات کے تھے اور ان میں اسی قدر رعونت بھری تھی۔

ان نوجوانوں نے سندھی کلرکوں اور ہیڈ کلرکوں اور خود کو روسی ادیب سمجھنے والے پرائمری اسکول کے ٹیچر کو کبھی دیکھا تک نہ تھا جو اگر چند برس یہاں رہ پاتے تو پیسے جمع کر کے اور دفتر یا بینک سے قرضہ لے کر موٹر سائیکل خرید سکتے تھے اور گوٹھ سے بچوں کو بلا کر پورے خاندان کو ایک موٹر سائیکل پر متوازن کر کے انہیں شام کو کلفٹن پر ساحل سمندر کی سیر کرا سکتے تھے۔ وہ اتنے تتر بتر اور دبے دبے تھے--- شہر کی بیگانگی اور خود اپنے نووارد وڈیروں کی رعونت سے اس قدر دبکے ہوئے--- کہ ان کا نظر آنا ممکن نہیں تھا' بالکل اسی طرح جیسے شہوت بھرے اونچے اونچے قہقہے لگاتے وڈیروں کا دور ہی سے دکھائی دے جانا لازمی تھا جو مملکت کے اس شہر کے اولیں بڑے اور مستحکم متوسط طبقے میں پیوند نہیں ہو سکتے تھے۔

مگر حقیقت یہی ہے کہ اگر پہلے منتخب وزیر اعظم اپنے جلو میں لس لساتے' رعونت بھرے وڈیروں کی کھیپ کراچی نہ لے آتے تو پہلی منتخب حکومت کے دور میں ہمارے بظاہر سندھی قوم پرست مگر باطنی طور پر روسی ادیب' سندھی پرائمری ٹیچر کی موٹر سائیکل اور اس کے خاندان کی ساحل سمندر پر سیر کے امکانات موجود تھے پھر شاید وہ روس جا کر بسنے کا ارادہ بھی ترک کر دیتا۔

◆ ◇ ◆ ◇ ◆

مگر ہوگا نہیں ایسا

آنے والے برسوں میں ایم کیو ایم بنی--- مہاجر قومی موومنٹ--- اور تمام مہاجر جیسا کہ انگریزی اصطلاح ہے فرد واحد کی طرح اس میں شامل ہوگئے' اتنی بھاری عددی قوت کے ساتھ کہ ایسا کسی نے آنکھوں دیکھا اور نہ کانوں سنا۔

لوگ کہتے۔ "ارے خالہ' ارے چچی جان' ارے دولہا بھائی' ایسا جوش' ایسی وفاداری' ایسا جذبہ تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا!"

مارٹن کوارٹرز میں اور حیدری میں اور محمود آباد میں بڑے بوڑھے سفید کرتوں میں لپ لپاتے' جھکی کمریں سیدھی کرتے ہوئے کہتے۔ "بھئی واہ' کیا بات ہے! یہ اتحاد دیکھ کر تو قیام پاکستان سے پہلے کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ ارے اپنے آگرہ میں' کانپور میں' بنارس میں مسلم لیگ کے جلسوں میں نظر آتا تھا یہ جوش اور ولولہ! یہ عزم یا تو تب دیکھا تھا یا اب دیکھ رہے ہیں۔"

◆ ◇ ◆ ◇ ◆

دیکھیے کہ مسلم لیگ نے اپنے مردہ بطن سے بچہ جنا ہے!" چھکن بھائی نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور چہل قدمی کرتے ہوئے کہا۔ چھکن بھائی امریکہ سے چند ہفتوں کے لیے آئے ہوئے ہیں اور حیدری میں اپنی بڑی بہن کے گھر ٹھہرے اس وقت رات کے کھانے کے بعد ہوا خوری کر رہے ہیں۔ پیٹ پر ہاتھ کیوں پھیرتے ہیں؟ بھئی یوں ہی' طمانیت کے اظہار کے لیے!

"دیکھو بھئی' معاملہ تب بھی مائنارٹی کا تھا اور اب بھی وہی مسئلہ درپیش ہے۔" چھکن بھائی اپنے بھانجے اور بھانجی کو سمجھا رہے ہیں۔ "مائنارٹی پراونسز کے مسلمان پریشان تھے کہ ہندوستان میں ان کی حیثیت کیا ہوگی' سو وہ یک جان ہو کر پاکستان کے حصول کے لیے کوشاں ہو گئے۔ پاکستان بن گیا۔ اب یہاں آ کر وہ دوبارہ مائنارٹی ہو گئے۔ اس طرح تحریک پاکستان چلانے والوں' اس ریل گاڑی کو اصل ایندھن مہیا کرنے والوں کی اولاد نے ایم کیو ایم بنائی۔ یہ لوگ اسی جوش و خروش سے اب ایم کیو ایم کے حامی بن چکے ہیں۔ دراصل یہ مسلم لیگ کا دوسرا جنم ہے۔"

"اور نظریۂ پاکستان؟"

"تو پیارے بیٹے' نور نظر' لخت جگر! گروہی مفادات نظریئے کی چھتر چھایا خود بناتے ہیں۔ یعنی آپ یہ کایا کلپ دیکھیے اور اس پر غور کیجئے کہ روٹی کپڑے اور آسائشوں کی ضرورت اجتماعی بننے کے عمل میں کسی قلب ماہیت سے گزر کر اپنی مادی نجاست سے پاک ہو کر مقدس' بلکہ الوہی بن جاتی ہے۔ آدمی اپنے روٹی کپڑے کے حصول کی لڑائی کو بہ آسانی اللہ کے نام اور حکم پر جہاد سمجھنے لگتا ہے۔"

چھکن بھائی امریکہ میں رہتے ہیں اور "مفادات" کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔

"تو فرض کیجئے کہ مہاجر اپنی نعرے بازی کے برعکس اسلام اور پاکستان کے الوہی تصور کی خاطر نہیں آئے تھے' روٹی پانی کے لیے آئے تھے' تب کیا فرق پڑتا ہے؟ اکنامک مائیگریشن تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ اب دنیا بھر میں حقیقت پسند ماہرین اسے ایک ویلڈ (valid) ایک معقول وجہ ہجرت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ اماں تم نے کیوبا سے امریکہ آنے والے مہاجرین کا نہیں سنا؟"

چھکن بھائی پہلے حیدر آباد کے کسی کالج میں نفسیات پڑھاتے تھے۔ اسکالرشپ پر امریکہ گئے اور ڈاکٹریٹ کر کے واپس آئے۔ چند مہینوں میں انتظامیہ نے ان کا تبادلہ اندرون سندھ کسی انٹرمیڈیٹ کالج میں کر دیا۔ چھکن بھائی چپ چاپ امریکہ ہجرت کر گئے۔ اب وہاں کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔ اس وقت وہ بجلی کی روشنیوں میں جگمگاتی' حیدری کی پان کی دکان سے پان خرید کر کلے میں دبا رہے ہیں۔ بس یہی نہیں ملتا انہیں منے سوٹا میں' کھانے کے تمام مسالے اور درجنوں کے حساب سے لکھنوی کڑھائی کے کرتے اور سفید براق علی گڑھ کٹ پاجامے تو وہ ہر سال منگوا لیتے ہیں۔

"کیو بن مہاجرین---" چھکن بھائی کہتے ہیں' "تو اب تو دنیا اتنی بدل گئی ہے کہ قبلہ کاسترو سوشلزم کے ان بھگوڑوں کی فوری گرفتاری اور واپسی کے بجائے بڑے غصے سے امریکہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں وہیں رہنے دیا جائے۔ ارے بھئی کھائیں گے کمائیں گے اور کیا بقوم کسے کہ لینا ایک نہ دینا دو۔"

"تو باقی کے ملک سے بھی تو لاکھوں لوگ چلے آ رہے ہیں کراچی میں---" چھکن بھائی کے بھانجے نے بیزاری سے کہا۔ چھکن بھائی ہاتھ ہلاتے ہیں اور سمجھاتے ہیں۔

"دیکھو بھائی 1992ء میں ہماری یونیورسٹی کے ڈیموگرافی سنٹر کی ایک رپورٹ چھپی تھی--- آپ لوگوں کو بھی پڑھنی چاہیئے' فوٹو کاپی بھجوا دوں گا--- تو عالمی ماہرین نے پیشین گوئی کی ہے کہ آنے والی دہائیوں میں روزگار کی تلاش میں آبادیاں بڑی لہروں کی صورت میں جنوب سے شمال کی طرف اور گاؤں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کریں گی۔ اس کو تو کسی صورت روکا ہی نہیں جا سکتا۔" چھکن بھائی فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں' گویا کوئی کلاس لے رہے ہوں۔

چھکن بھائی کے بھانجے نے دوبارہ بیزاری سے کہا۔ "اور سندھی کہہ رہے ہیں کہ اتنے مہاجر! آ گئے' چھا گئے کھا گئے سب کچھ!"

بے شک' بے شک!" چھکن بھائی عقل مندی سے سر ہلاتے ہیں۔ "اتنی بڑی تعداد میں ایک ہی جھٹکے میں اتنی بڑی ڈیموگرافک تبدیلی پر مقامی لوگوں میں غم و غصہ تو پیدا ہونا ہی تھا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ بھئی کوئی معمولی بات تو نہیں ہوئی تھی' ہندوستان کی تقسیم! اتنا بڑا خون خرابا! آبادی کا اتنے بڑے پیمانے پر تبادلہ جس کی مثال دنیا بھر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ میں تو کہتا ہوں---" انہوں نے بھانجے کے ہاتھ سے الائچی قبول کرتے ہوئے کہا۔ "کہ سینتالیس میں ٹیلی ویژن نہیں تھا' اور خبروں کی ترسیل کے لحاظ سے دنیا اتنی چھوٹی نہیں ہوئی تھی ورنہ---"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ؟ ارے بھئی' مثلاً اگر بوسنیا پہلے ہو گیا ہوتا تو دنیا کے بڑے عبرت پکڑ کر اور سبق سیکھ کر ہندوستان کی تقسیم کبھی نہ ہونے دیتے۔ یعنی کوئی بات ہے! ایسی اکھاڑ پچھاڑ جس نے سماجیات کی تو کیا کہتے ہیں ایسی تیسی کر دی اور مائنارٹی پراونسز کا مسئلہ جسے کہتے ہیں وہ حل ہی نہیں ہوا۔ یعنی وہ وہیں ہیں جہاں تھے بلکہ اور بھی پیچھے چلے گئے۔

"اب یہ ہے کہ کو ایگزسٹنس' یعنی ساتھ ساتھ مل جل کر رہنا نہایت اہم ماحولیاتی ضرورت ہے بلکہ سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ کے لیے لازمی۔ علاوہ ازیں دنیا بھر کے چھوٹے سے چھوٹے کلچر کی وائلڈ لائف کی طرح پریزرویشن کی جارہی ہے یعنی ملٹی کلچرازم۔"

"جیسا کہ گانا ہے' مل جل کر رہو اور پیار کرو' ہے چیز یہی جو رہتی ہے!" شکیلہ نے کہا۔

چھکن بھائی کی یہ نو عمر بھانجی وی سی آر پر خوب انڈین فلمیں دیکھتی تھی اور اس وقت حیدری کی ایک دکان پر جگر مگر کرتی چوڑیوں پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

"تو چھکن ماموں' آپ تو یہاں رہتے نہیں۔ آپ کے خیال میں ہونا کیا چاہیئے؟"

چھکن بھائی مشورہ مانگے جانے پر خوش ہوئے۔ ان سے پوچھا جاتا تو وہ حیدر آباد سندھ میں اپنے کالج کی انتظامیہ کو کالج میں ایک بڑا نفسیاتی علوم کا مرکز قائم کرنے کا مشورہ دیتے۔ شہری نفسیات' دیہی نفسیات' کاروباری اور زرعی نفسیات--- الغرض پندرہ سیمینار کرواتے سال میں۔ پھر وہ امریکہ نہ جاتے اور ان کا ہزاروں ڈالر ماہانہ کا نقصان ہوتا۔ خیر' پھر بھی انہوں نے کچھ سوچ کر مشورہ دیا۔

"بھئی ہونا یہ چاہیئے کہ سندھیوں کو یہ خناس دماغ سے نکال دینا چاہیئے کہ مہاجر تا عمر اور نسل در نسل یہاں مہمان یا دوسرے درجے کے شہری بن کر رہیں گے۔ سندھ اب عملاً دو زبانی صوبہ ہے۔ سو اس بات کو مان کر چلا جائے' دشمنی کا ماحول ختم کر کے کوشش کی جائے کہ سندھ کی ترقی میں مہاجروں کو شامل کیا جائے اور مہاجروں کو بھی یہ خناس دماغ سے نکال دینا چاہیئے کہ کراچی کوئی ان کی ایسی جاگیر ہے جس میں دو سندھی داخل ہوں تو وہ واویلا مچانا شروع کر دیں۔ کراچی کو سندھیوں کے لیے ممنوعہ علاقہ بنانے کی خواہش کو الوداع کہنا چاہیئے۔"

چھکن بھائی کا بھانجا غور سے ان کی عالمانہ باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"مگر ہو گا نہیں ایسا!"

"پھر کیا ہو گا؟" چھکن بھائی نے منہ اٹھا کر سوال کیا۔

"میرے خیال میں--- ان کے صرف ایم بی اے پاس پاکستانی تجربہ کار بھانجے نے کہا۔ "کہ پہلے ایک پر مار پڑی اور دوسری کو حکومت دے دی گئی--- برائے نام سہی' مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ پہلی انتظار کرتی رہی کہ کب میری باری آئے پھر پہلی کی باری آئی اور دوسری پر مار پڑی' خاصی تگڑی مار۔ پہلی کو حکومت دے دی گئی--- برائے نام سی' مگر مار

سے محفوظ حیثیت۔ تو آپ کے خیال میں اب دوسری کیا کر رہی ہے؟" اس نے چھکن بھائی سے پوچھا۔

"کیا کر رہی ہے! واویلا مچا رہی ہے' اور کیا؟"

"وہ تو ہے مگر---" بھانجے نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ساتھ ہی انتظار بھی کر رہی ہے۔ انتظار' کہ اب میری باری دوبارہ کب آئے گی۔"

چھکن بھائی نے کہا۔ "اس پر مجھے اس بلی کی کہانی یاد آرہی ہے جو دو چوہوں میں پنیر تقسیم کر رہی تھی۔"

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

شہر(2)

پیچھے رہ گیا کراچی--- دس ہزار فیٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے آپ سوچتے ہیں' پیارا کراچی--- اچھا کراچی--- آپ دل ہی دل میں شہر کے طمانچے کھائے گال سہلاتے ہیں۔ شہر محنت کشاں' جو اپنے مزاج میں اتنا بے نیاز ہے کہ سخت ترین مارشل لاء میں بھی کسی فوجی راج کے محکوم ملک کا شہر نہیں معلوم ہوتا' جہاں افسران بالا آتے ہوئے اس بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ کم از کم اس شہر میں ان کے گریڈوں سے' افسرشاہی کی سیڑھی پر ان کے خاص الخاص مقام سے کوئی مرعوب نہیں ہوگا' جہاں لوگوں نے اپنی دنیائیں آپ بنائی اور آباد کی ہیں اور آپ یاد کرتے ہیں سینے میں فخر کا ابال جب آپ کبھی رات کے دو بجے (اپنے سبزے' گیدڑوں اور بیورو کریٹوں میں غرق' خوابیدہ دارالسلطنت سے) وہاں پہنچے ہوں اور اسے بیدار اور روشن پایا ہو۔

جب فائرنگ سے شہر میں کثیرالتعداد قتل ہونا شروع ہوئے تو دو ایک روز ہی میں شہر میں ایک غیر مرئی خط فاصل کھنچ گیا۔ شہر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا--- غریب اور امیر حصوں میں۔ یہ غریب حصے تھے جہاں فائرنگ ہو رہی تھی' سڑکوں پر چکراتی لاشیں گر رہی تھیں' گلیوں سے جنازے اٹھ رہے تھے۔

یہ خوشحال علاقے تھے--- ڈیفنس سوسائٹی' کلفٹن--- جہاں رونق میں کمی نہیں آئی تھی' سی ویو پر ریستورانوں میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی' موٹر گاڑیوں کو پارک کرنے کی جگہ نہ تھی' جہاں کلاشنکوفوں کا دھواں نہیں' چرغوں اور تکوں اور تلے ہوئے جھینگوں کی بھاپ کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

جس رات ہاؤسنگ سوسائٹی کے ایک گھر میں اکٹھے سات قتل ہوئے (پولیس چوکی سے چند گز کے فاصلے پر' جبکہ پاس طارق روڈ کا بازار رمضان کی ان آخری راتوں میں پوری طرح بیدار تھا) لالہ رخ صبح یہ خبر سن کر دوڑتی ہوئی پڑوس میں گئی۔ اس کی پڑوسن' صائمہ باجی اس وقت گھر میں اکیلی تھیں' ان کے شوہر دو دن کے لیے دفتر کے کسی کام سے فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ وہ ٹیلیفون پر کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ لالی کے کان میں باتوں کے جو ٹوٹے ٹکڑے پڑے ان سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ اسی واردات کے بارے میں بات کر رہی ہیں جو ان کے گھر سے صرف تین گلی پیچھے ہوئی تھی۔

فون رکھ کر صائمہ پلٹیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں عورتیں دہشت سے ٹھٹک گئیں۔

دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی' اس بار ذرا زور سے۔

"کون--- کون ہے؟" گھر والی نے بلند آواز سے پوچھا۔

"میں ہوں جی پلمبر" ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ محلے کا نلکے ٹھیک کرنے والا آیا تھا۔ صائمہ باجی کے باورچی خانے کا نل کئی دن سے رس رہا تھا۔ کل ہی تو انہوں نے لڑکا بھیج کر کہلوایا تھا کہ وہ کسی وقت آکر دیکھ لے اور اب لالہ رخ کے ساتھ کھڑی وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں' اس سوچ میں گم کہ دروازہ کھولیں یا نہ کھولیں۔ آخر انہوں نے پلمبر کو بلا لیا۔ وہ اسے نل دکھانے باورچی خانے میں لے گئیں۔

لالہ رخ گول کمرے کے وسط میں گم سم کھڑی رہی۔ جب صائمہ باورچی خانے سے نکلیں تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے لالہ رخ کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا۔ "باجی--- آج آپ نے سنا نا--- ہماری گلی کے پیچھے--- کل رات یہ سب ہوا۔ یا اللہ! پورا روڈ چل رہا تھا۔ یہ کس وقت ہوا ہو گا؟ کسی کو خبر کیوں نہیں ہوئی؟"

صائمہ ساری کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی گول کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کہتے ہیں گیارہ بجے وہ لوگ آئے تھے۔"

"تو یہ--- یہ--- کیا قصہ تھا؟" لالہ رخ نے انتہائی منتشر دماغ سے سوال کیا۔ "شیعہ سنی؟ یا--- یا کچھ اور؟"

صائمہ باجی کا زرد پڑا ہوا چہرہ سرخ ہو گیا۔ انہوں نے چیخ کر کہا۔

کہاں ہو رہی ہے شیعہ سنی کی لڑائی؟ آپ جانتی ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے' کون لوگ

یہ قتل کر رہے ہیں۔ جیسے جانتی نہیں۔۔۔"

لالہ رخ بھونچکا رہ گئی۔ یہ حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ گڑبڑاہٹ میں وہ "میرا مطلب تھا باجی۔۔۔" بدبداتی' خاموشی سے صائمہ بیگم کے گھر سے نکل کر اپنے گھر آ گئی۔ گھر آ کر وہ گم سم اپنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نند نے اسے اس حالت میں دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے بھابی؟ کہاں گئی تھیں؟"

"ہیں؟" اس نے چونک کر کہا۔ "یہیں پڑوس میں' صائمہ باجی کے یہاں۔"

"تو کیا بات ہو گئی؟" نند نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" لالہ رخ بالکل گم سم تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ اسے اپنے چاروں طرف سناٹا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا جس میں وہ کسی چڑیا کی آواز' دور کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی غراہٹ اور پنکھے کی گھر گھر اچانک سن سکتی تھی۔ بہت دیر تک وہ دم بخود بیٹھی رہی۔ پھر اس نے تاثر سے خالی آواز میں کہا۔

"صائمہ باجی۔۔۔ صائمہ سمجھتی ہیں کہ یہ قتل۔۔۔ شاید میں نے کرائے ہیں۔"

پلمبر کے جانے کے بعد صائمہ نے دروازہ بند کیا۔ صبح سے ان کے گھٹنے میں ہلکا ہلکا درد تھا جو اچانک شدت پکڑ گیا تھا۔ کچھ لنگڑاتی ہوئی وہ اپنے سونے کے کمرے میں آ کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے چار اطراف نظر ڈالی' خالی دیواریں' ہوا کے جھونکے سے سرسراتا پردہ' فرش پر بچھا پرانے قالین کا ٹکڑا۔ گھر خالی تھا۔ پچھلے گلیارے سے کوئی ٹین کھڑکھڑاتا ہوا گزرا۔ صائمہ بیگم دونوں ہاتھوں میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ بہت دیر اکیلے گھر میں بیٹھی روتی رہیں۔ پھر انہوں نے اپنی بہن کو فون کیا۔

"مجھ سے تنہا رہا نہیں جاتا۔ مجھے آ کر لے جاؤ۔"

پھر بعد میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ دراصل قاتلوں کو ایک شیعہ کی تلاش تھی جو کہ مارا گیا۔ (مرنے والوں میں ایک شیعہ بھی تھا۔) دوسرا خیال یہ تھا کہ قتل کا مقصد شہر میں دہشت پھیلانا تھا۔ تیسرا خیال یہ تھا کہ یہ دراصل ڈاکے کی واردات تھی۔

پھر ایک دھند ہر طرف چھا گئی۔

جوں جوں تشدد کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا تھا وہ نابینا ہوتے جا رہے تھے۔۔۔ ایک اصطبل میں بند۔۔۔ ان کے درمیان ایک ہاتھی تھا اور وہ اس کے اس عضو پر جو ان کے سامنے

تھا ہاتھ پھیر پھیر کر ہاتھی کی شکل کی وضاحت کر رہے تھے اور انہیں اس کی پروا نہ تھی کہ اس کے پیروں تلے وہ سب کچلے جا رہے ہیں' کیونکہ ان کی آنکھوں پر اپنے اپنے موقف کی پٹی بندھی تھی۔

بات صرف اتنی نہ تھی کہ وہ لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔۔۔ شہر کے ساتھ کی جانے والی ایک زبردستی' ایک بلاتکار کے دوران وہ حقیقت جاننے کی خواہش سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ ہر وقوعے کو اپنی مرضی کا مطلب پہنا رہے تھے اور سرمو جاننا نہیں چاہتے تھے کہ کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے۔

شہر ان گنت لکیروں میں تقسیم تھا جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اجتماعی ناگہانی میں خوف سے لرزتے ہوئے۔۔۔ تنہا۔۔۔ کسی سے جڑ جانے کی اضطرابی سعی میں ان کے اندر قدیم ترین گلے کی جبلت جاگ اٹھی تھی جو فی الحال زبان کی بنیاد پر انہیں دوسروں سے جوڑ سکتی تھی۔

سندھی سندھی سے' اردو بولنے والا اردو بولنے والے سے' پٹھان پٹھان سے اور پنجابی پنجابی سے جڑا ہوا۔۔۔

نفرت اور انتقام کی آگ میں جھلستا ہوا شہر۔۔۔

ریاستی مشینری سچ بتانے سے قاصر یا گریزاں' اپنی ہی کسی توڑ مروڑ مہم میں غلطاں۔۔۔

جب مساجد کے اندر خونریزی شروع ہوئی تو سرکاری اداروں نے کہا۔ "مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں' بھارتی ایجنٹ!"

کراچی کے گلی کوچوں میں لوگوں نے کہنا شروع کیا۔ "مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں' وہ سندھی پولیس جو اندرون سندھ سے کراچی لائی گئی ہے' سب ہندو ہے' کیونکہ تمام سندھی ہندو ہیں۔ یہ بظاہر مسلمان بن گئے ہیں۔ راجہ داہر کی اولاد!" ان کی نظر میں ہندو اس وقت تک ٹھیک طرح سے قابل نفرت نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ سندھی بھی نہ ہو۔

اس طرح پاکستان بنانے سے پاکستان میں بسنے تک کا ایک دائرہ مکمل ہوتا ہے۔

ریاست کی داغ بیل پڑنے کے ساتھ ہی جس سرکاری پالیسی کا زور شور سے اعلان اور پرچار کیا گیا' یوں بھی' "مسلمان کے لیے مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔" دوسرے لفظوں میں۔ "قتل کرنا بری بات نہیں' مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔"

لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر کہہ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

اور سندھی، مبادا آپ انہیں فرشتہ سمجھیں۔

کراچی سے متعدد سندھی اخبار نکلتے ہیں۔ ایک آدھ مضمون کو چھوڑ کر ان کا لہجہ اس مصیبت زدہ شہر کے لیے نفرت اور حقارت ہی کا ہوتا ہے۔ صوبائی خودمختاری کے لیے تحریک چلانے کے باعث سرکاری ادراک کے مطابق برسوں تک غیرمحب وطن اور بھارتی ایجنٹ وغیرہ کہلائے جانے والے سندھی--- ان کا پڑھا لکھا طبقہ، ان کے دانشور--- اقتدار اور سرکاری قبولیت کی پہلی جھلک ملتے ہی ایک قلب ماہیت سے گزرتے ہیں اور سرکاری زبان میں بات کرنے لگتے ہیں۔ وہ مہاجر صوبہ بنانے کا--- ملک سے علیحدگی کا نہیں، صرف صوبہ بنانے کا--- مطالبہ کرنے والوں کو حکومت کا، بلکہ ریاست کا باغی قرار دیتے ہیں اور انہیں (کم از کم کئی ہزار نفوس کو) سرعام پھانسی پر لٹکانے کے جواز میں آئین سے شقیں نکال سکتے ہیں۔ وہ تمام مہاجروں کو صرف دہشت گرد کے نام سے یاد کر سکتے ہیں اور گو انہوں نے ابھی تک مہاجروں کو ہندوؤں کی اولاد نہیں کہا ہے (انہیں اس کا موقع نہیں ملا ہے) لیکن طویل مدت سے دیئے جانے والے سرکاری بیانات کو--- کہ مہاجروں کی نمائندہ جماعت دراصل ہندوستانی خفیہ ادارے "را" کی ایجنٹ ہے--- وہ بتدریج سنجیدگی سے قرار واقعی قدر و منزلت دینے لگے ہیں۔ سندھی اتنے طویل عرصے تک معتوب رہے ہیں، اپنے خلاف زہر آلود بیانات سنتے رہے ہیں کہ شاید وہ اپنے اوپر تھوپی گئی اس جہالت اور تاریکی کا جواب جہالت اور تاریکی ہی سے دینا چاہتے ہوں۔ اپنے وطن میں بہتر اقتدار کی جیت انہوں نے کبھی دیکھی بھی نہیں ہے۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

کراچی اور جرمن

برٹولٹ بریشٹ جرمن تھے، اور اڈولف ہٹلر بھی۔ نازی پارٹی کے لاکھوں ارکان اور حامی بھی جرمن تھے، پاکستانی، حتیٰ کہ ہندوستانی تک نہیں تھے۔

برٹولٹ بریشٹ اگر پاکستانی اور کراچی میں رہنے والے مہاجر ہوتے تو اپنی نظم یوں لکھتے۔

پہلے، بہت پہلے، سب سے پہلے
وہ پٹھانوں کے لیے آئے
(یہ غدار ہیں، علیحدگی پسند ہیں)
(پختونستان بنانا چاہتے ہیں، ہندوستانی ایجنٹ ہیں)
میں پٹھان نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں اس کورس میں شامل ہوا
اور میں نے گایا
مارو--- پکڑو--- جانے نہ پائے---

پھر وہ بنگالیوں کے لیے آئے
غدار--- علیحدگی پسند، ہندوستانی ایجنٹ
میں بنگالی نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے گایا

مارو--- پکڑو--- جانے نہ پائے---
نامنظور--- نامنظور--- بنگلہ دیش نامنظور

پھر وہ بلوچوں کے لیے آئے
غدار--- علیحدگی پسند--- ہندوستانی ایجنٹ---
میں بلوچ نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا' میں نے گایا
مارو--- پکڑو--- جانے نہ پائے---

پھر وہ سندھیوں کے لیے آئے
غدار--- علیحدگی پسند--- سندھو دیشی--- ہندوستانی ایجنٹ---
میں سندھی تو خیر ہرگز نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا' میں نے زیادہ جوش و خروش سے سر اٹھایا
مارو--- پکڑو--- جانے نہ دینا---

اب وہ میرے لیے آئے ہیں
غدار--- علیحدگی پسند--- ہندوستانی ایجنٹ---
میں نہایت حیران پریشان کھڑا ہوں
اور سن رہا ہوں ایک کورس
سندھیوں' بلوچوں' پٹھانوں' پنجابیوں کی آوازوں کا
کورس میں شامل ہونے والی تازہ تازہ' نو آموز' کمزور سی آوازیں
جنہیں ابھی ٹھیک سے غدار' ہندوستانی ایجنٹ کہنا بھی نہیں آیا
مگر پھر بھی وہ لوگ مشق کر رہے ہیں
دھڑکتے دلوں سے' امید بھری امنگ سے
کہ ایک دن ان کی ادائیگی بے نقص ہو جائے گی

1996ء تک جبکہ مملکت خداداد اپنے استقرار کے انچاس . ں پورے کر رہی ہے' ہر قوم کو بازی باری غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا جا چکا ہے--- ماسوا پنجابیوں کے۔
اب رہے پنجابی' تو اس قوم (قومیت؟) میں انفرادی طور پر تو ہندوستانی ایجنٹوں کی کمی

نہیں' شاعر فیض احمد فیض' شاعر حبیب جالب' صحافی مظہر علی خاں' سیاستداں میاں افتخار الدین۔ یہ فہرست اتنی طویل تو یقیناً ہے کہ ان کی تعداد پاکستان میں بسنے والی کسی بھی قومیت کے انفرادی طور پر اعلان شدہ غداروں اور ہندوستانی ایجنٹوں سے بڑھ کر ہوگی مگر ابھی تک پنجابیوں کو من حیث القوم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اب آگے چل کر دو ممکنہ صورت حالات ہو سکتی ہیں۔

1 بقیہ تمام پاکستانی قومیتیں ایک دن پنجابیوں کو کسی سیاسی تحریک کی بنیاد پر یا کوئی دوسری جگاڑ لڑا کر من حیث القوم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے دیں گی۔

2 دوسری قومیتیں اسٹیبلشمنٹ پر اس حد تک قبضہ نہ کر پائیں گی کہ پنجابیوں کو غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے سکیں۔ لہٰذا اسٹیبلشمنٹ کے پنجابی افراد ہی باری باری دوسروں کو (ہر بار دوسرے دوسروں کی مدد سے) غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا دو امکانی صورت کے علاوہ یہاں تیسری صورتحال پیدا نہیں ہو سکتی۔ یا اگر آپ ایک ناقابل شکست رجائیت پرست ہوں تو اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں۔
"کیا یہاں کوئی تیسری صورتحال پیدا نہیں ہو سکتی؟"

اب رہا ہندوستان' تو ہندوستان تو بہت ہنس رہا ہوگا۔ ایمان سے' کہنی میں منہ چھپا چھپا کر' چپکے چپکے ہنستے ہوئے لوٹن کبوتر کی طرح زمین پر لوٹ رہا ہوگا اور ہنسی کے مارے آنکھوں سے بہتے پانی کو پونچھتے ہوئے کہہ رہا ہوگا۔

"لو سالو' ہور چوپو! الگ تو ہم سے ہو گئے ہو تم' میاں بھائی! اب دیکھو کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے--- یعنی باری باری ہر قومیت ہماری ایجنٹ!! ہاہاہا! قہ قہ!"

سالا بنیا--- مکار ہندو! ہم پر ہنستا ہے سالا دال خور---

مگر ہندوستان 1995ء میں ہنس نہیں رہا۔ شاید وہ کچھ خاص غور سے پاکستان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا' بلکہ تندہی سے ماتھے پر سیندور کا گھسا مارے' مذہبی جنونی سیاست کی طرف رواں دواں ہے۔

کیونکہ--- کیونکہ وہ پاکستان سے مختلف ہے ہی نہیں۔ بالکل اسی جیسا تو ہے ہندوستان!

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

لہو کا سراغ

سمندر کے ساحل کلفٹن پر اونٹ کی سواری پرانے شہر کے وسط میں بچھی چمکتی پٹریوں پر گھنٹی بجا بجا کر چلتی کھلونا سی ٹرام اور سجی سجائی دو گھوڑوں والی کسی رتھ کی شان سے پکی سڑک پر ٹپ ٹپ کرتی جاتی وکٹوریہ گاڑیوں کے علاوہ نعیم کی کراچی کی اولیں یادوں میں ایک ہلچل بھری رات بھی تھی۔ اس رات کوئی نہیں سویا تھا۔

نعیم کراچی سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر حیدر آباد سندھ میں رہتا تھا اور ان دنوں کراچی اپنی پھوپھی کے پیر الٰہی بخش کالونی کے تین تنگ کمروں' ایک دالان اور چھوٹے سے آنگن والے کوارٹر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس آنگن میں سلمانہ پھوپھی نے رات کی رانی اور چنبیلی کے جھاڑ لگائے تھے۔

پیر الٰہی بخش کالونی--- جسے بعد میں سب صرف پی آئی بی کالونی کے نام سے جاننے لگے تھے--- مہاجرین کی پہلی کھیپوں کے لیے عجلت میں تعمیر کی جانے والی مختصر اقامتی کالونیوں میں سے ایک تھی۔ دو رویہ کوارٹر' بیچ میں سڑک اور دکانیں جہاں بدایوں کے پیڑے اور آگرہ کے سیو اور میرٹھ کی کزک ملتی تھی اور دہی بڑے بھی۔

دہی بڑے' ایسے نہیں جیسے اب ملنے لگے ہیں۔ سلمانہ پھوپھی 1995ء میں کہتی ہیں۔ "یہ تو دہی پھلکیاں ہیں بیسن کی وہ بھی نگوڑی میٹھی۔ یہ فریسکو والے اللہ جانے کیا بناتے ہیں!" سلمانہ پھوپھو جانتی ہیں کہ اصلی دہی بڑے کیسے بنتے ہیں۔ "ارد کی دال کو رات بھر بھگوتے ہیں' دوسری صبح نرم پڑی دال کو سل پر ہلکے ہاتھ سے پیستے ہیں کہ وہ بس دردری ہو جائے پھر ملاتے ہیں اس میں توے پر سینک کر ہتھیلی پر مسلا زیرہ' نمک اور موٹی پسی ہوئی کالی

مرچ۔ چاہو تو ذرا سی لال مرچ بھی ملا دو۔ پھر بڑے بنا کر اچھی طرح بھاپ دیتے ہیں تاکہ نیم پخت ہو جائے۔ شامی کباب کی طرح دہی بڑے بناتے ہیں۔ پھلکیاں نہیں' تمہارے فریسکو جیسی۔ بڑے تو چپٹے ہوتے ہیں' چپٹے اور گول---"

"اور تم بڑوں کو تل کر بغیر دہی کے یوں بھی کھلا سکتی ہو" وہ اپنی بیٹی نشاط بانو سے کہتی ہیں جو لپ جھپ باریک روپہلے گوٹے کی چنگی بنا رہی تھی۔ انکی پتلی پتلی انگلیوں میں گوٹے کا فیتہ آن کی آن میں ایک خوبصورت' آرائشی' نفیس اور گرانقدر (value-added) شے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ چنگی' کلی اور کرن پیر الٰہی بخش کالونی کی دکانوں میں فروخت ہوں گی۔

سلمانہ پھوپھو بیوہ ہیں۔ وہ آگرے سے پی آئی بی کالونی کیوں کر پہنچیں۔ یہ ایک دوسری داستان ہے مگر عبدالقادر بہرانی کے موجودہ تصور کے برعکس--- کہ ہندوستان سے پناہ گیر' جو اب اپنے آپ کو مہاجر کہنے پر مصر ہیں' بس یوں ہی سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے آ گئے تھے--- حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی صوبوں میں مسلمان بھاری تعداد میں مارے بھی گئے تھے۔ سلمانہ پھوپھو اسی لیے پی آئی بی کالونی میں بیوہ پہنچی تھیں! اپنی اور اپنے بچوں کی خیر مناتی' ایک کٹی ہوئی ٹرین سے مہاجر کیمپ تک۔ انہوں نے کراچی پہنچ کر ڈھاروں روتے ہوئے باقاعدہ زمین کو بوسہ دیا تھا اور کہا تھا۔ "پ---ا---ک---س---ت---ا---ن۔"

سن سینتالیس میں شادی شدہ زندگی کے دس برس گزارنے کے بعد' یہاں پہنچی سلمانہ پھوپھو شادی سے پہلے آگرہ سے ایف اے پاس کر چکی تھیں۔ اب وہ پی آئی بی کے اسکول میں پڑھائیں گی اور اپنے بچوں نشاط' مسرت اور احسن کی پرورش کریں گی۔ (اور بڑے ہو کر یہ سب ایم کیو ایم--- مہاجر قومی موومنٹ--- میں بھرتی ہو جائیں گے!)

اس ہلچل بھری رات سلمانہ پھوپھی کے گھر میں ان کے مہمان آئے۔ چھوٹے بھائی' نعیم کے باپ کے سوا کوئی مرد نہیں ہے۔

یہ 1965ء ہے۔ جنرل ایوب خاں اور قائداعظم کی بہن فاطمہ جناح انتخابی حریف ہیں۔ اس کڑے مقابلے میں کراچی کے باسیوں نے--- مہاجروں کی اس پہلی بڑی لہر نے جو کراچی کی زمین پر چھا گئی ہے--- فوجی جنرل پر جناح کی بہن کو ترجیح دی ہے۔ کراچی شہر نے جنرل ایوب خاں کی ایجاد کردہ بنیادی جمہوریت کے مراعات زدہ نظام تک میں بغاوت کی راہ نکالتے ہوئے فاطمہ جناح کو ووٹ دیا ہے۔

ایوب خاں بہرحال جیت گئے ہیں (کرسی نشین فوجی جنرل ہار نہیں سکتے!) اور اب ان کے

صاحبزادے مسمی گوہر ایوب کراچی والوں سے اس گستاخی کا انتقام لینے آئے ہیں' ایک جشن فتح منانے جس میں ان چرچر چرچر تیزی سے بولنے والے' پست قد' دبلے پتلے اور سانولے اور برصغیر کے نہایت گرم خطوں سے نازل ہونے والے سرکشوں کو سبق سکھلایا جائے گا۔

پی آئی بی کالونی میں رات کو حملے کا اندیشہ تھا۔ سب لوگ جاگ رہے تھے۔ محلے کے نوجوان گلیوں میں پہرہ دے رہے تھے۔ وہ بجلی کے کھمبوں کے ساتھ کھڑے تھے اور ہاتھ میں آجانے والی کسی بھی چیز (لکڑی کے ٹکڑے' پتھر' چمچے' کفگیر) سے کھمبے بجا بجا کر ایک دوسرے کو بیدار رہنے کا پیغام دے رہے تھے۔

آواز سے نعیم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس چھ سات برس کا لڑکا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ سلمانہ پھوپھو کے گھر کے سامنے والے کھمبے کے ساتھ سراج کھڑا تھا۔

"اوہو منے' تم اندر جاؤ!" سراج نے کہا۔

"سراج بھائی' میں بھی کھمبا بجاؤں گا۔"

سراج ان کے اپنے کنبے کا لڑکا تھا۔ دو کوارٹر چھوڑ کر ان کا گھر تھا۔ سلمانہ پھوپھی اور اس خاندان کا ایک دوسرے کے گھر روزمرہ کا آنا جانا تھا۔ سراج نے نعیم کو ایک چھوٹا سا بی پی کا چاکلیٹ دے کر گھر میں واپس بھیج دیا تھا۔

لوٹتے ہوئے نعیم نے کھڑکی میں نشاط کی چھوٹی بہن مسرت کے دھانی دوپٹے کی جھلک دیکھی۔

"تو مسرت آپا کھڑکی میں کھڑی تھیں--- کیوں؟" اس نے سوچا تھا۔ "شاید وہ بھی کھمبا بجانا چاہتی ہوں۔"

اس رات پی آئی بی کالونی پر حملہ نہیں ہوا تھا مگر شہر کی زیادہ غریب آبادیوں' جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے مہاجروں پر حملہ ہو تا رہا تھا۔ مارنے والے مقامی نہ تھے' وہ ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے خاص طور پر لائے گئے اجنبی بتائے جاتے تھے۔ ان وارداتوں نے شہر کے غریب اردو بولنے والے علاقوں میں شدید ہراس پھیلا دیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر شاید نہ ملے مگر اس ملک کی اصل تاریخ اپنی لافانی نظموں میں رقم کرنے والے شاعر فیض احمد فیض نے ان ہی کے بارے میں لکھا تھا۔

کہیں نہیں ہے' کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

قاتلوں کو کبھی پکڑا نہیں گیا تھا' نہ کسی پر فرد جرم عائد کی گئی تھی۔

نہ مدعی نہ شہادت' حساب پاک ہوا
یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

سلمانہ پھوپھی کا خاندان نشاط بانو' مسرت بانو اور احسن' عصمت چغتائی کی کسی کہانی (مثلاً "چوتھی کا جوڑا") سے سیدھا نکل کر آیا ہوا معلوم ہو سکتا ہے۔ نشاط بانو اسی طرح سر جھکائے پراٹھے سینکتی ہیں۔ مسرت دریچے میں کھڑی نگاہیں جھکائے' کلائی میں چوڑی گھماتی ہے (جو سراج اسے ہم آغوش کرتے ہوئے چٹخا دے گا)۔ وہ مسرت سے شادی نہیں کرے گا۔ اس کی اور بنیادی خالہ (اس کی اماں) کی نگاہیں نئے ملک میں سماجی حیثیت بنانے کی خاطر اونچے خاندانوں پر لگی ہیں (نجرلاگی راجہ تورے بنگلے پر!) جلد ہی یہ پی آئی بی کالونی سے کہیں اور منتقل ہو جائیں گے۔ (ہاؤسنگ سوسائٹی؟ اس محلے کی تعمیر کے رموز کے لیے دیکھیے "ہاؤسنگ سوسائٹی" از قرۃ العین حیدر) آئندہ برسوں میں سراج سی ایس پی کا امتحان دے کر ڈپٹی کمشنر تعینات ہو جائے گا اور ایک بلندی کی جانب حرکت کرتی ہوئی (upwardly mobile) تازہ دم توانا کلاس کا حصہ بن جائے گا۔

مگر چونکہ کراچی کی پی آئی بی کالونی یوپی کا کوئی قدیم اپنی روایتوں کی چھاؤں میں نیم خوابیدہ شہر نہیں ہے (اور یہ عصمت چغتائی کی کہانی نہیں ہے) اس لیے نشاط بانو اور مسرت بانو کی شادیاں جلد یا بدیر ہو جائیں گی۔ نشاط کی شادی فرقان سے ہوئی جو کسی چھوٹی موٹی فرم میں کلرک تھے (حالانکہ ان کے پاس ایم اے کی تین ڈگریاں تھیں۔ اردو' اسلامیات اور تاریخ)۔ مسرت نے بی اے کر کے اسکول میں ملازمت کر لی اور گھر کا خرچ چلانے میں ماں کی مدد کرنے لگی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے زمانے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا اور بچوں کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنا اتنا سہل نہیں تھا۔ سلمانہ پھوپھو صبح کے وقت مقامی اسکول میں پڑھاتی تھیں اور دوپہر کے بعد جہانگیر روڈ پر ٹیوشن سنٹر میں پڑھانے جاتی تھیں۔ احسن اسکول کے بعد ڈرگ روڈ پر ایئرفورس کے جہازوں میں لوڈر کا کام کرنے لگا۔ لوڈر کا نیلا لباس وہ گھر میں بھی چھپا کر رکھتا تھا کہ کسی دوست کی نظر نہ پڑ جائے۔ اسے رات کی شفٹ میں کام مل گیا تھا۔ وہ اپنا یونیفارم تھیلے میں چھپا کر لے جاتا اور صبح کو اسی طرح سفید پوش لوٹتا جیسا کہ محلے کے لوگوں نے اسے دن کے وقت دیکھا تھا۔

پی آئی بی کالونی میں سلمانہ پھوپھی کا گھروندے جیسا یہ مکان کسی عبادت گاہ کی طرح

مقدس ہے۔ اس کے در و دیوار سے محنت شاقہ کی مہک آتی ہے اور اس کے دسترخوان پر ماسوا رزق حلال کے اناج کا ایک ذرہ بھی نہ رکھا گیا ہو گا۔

اس مختصر اور پاس پڑوس میں نہایت محترم خاندان پر چند برس بعد ایک ناگہانی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ ایک رات ایئرفورس کے ٹارمک پر جہاز سے سامان اتارتے ہوئے کسی ٹرک سے ایک بھاری بکس احسن کی پیٹھ پر آ گرا۔ احسن کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی تھی۔

یہ خبر سن کر کنبے اور محلے والوں کے دل دہل گئے۔ بیوہ کا لال' یتیم اور نیک بچہ--- اس کی صحت یابی کے لیے اپنے تو کیا غیروں تک نے جھولی پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگیں۔

احسن کئی برس چارپائی سے لگا رہا۔ صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ دوبارہ جسمانی مشقت کا کام کرنے کے قابل نہیں ہو سکا مگر اس نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔

مسرت نے سات برس اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ چارپائی سے لگے چھوٹے بھائی کا بوجھ ماں پر چھوڑ کر بیاہ نہیں رچا سکتی تھی۔ (جیسا کہ فلم "وچن" میں گیتا بالی کرتی ہے' حیرت کہ زندگی بالکل فلم جیسی ہو سکتی ہے!) اس کے بعد ایک شریف خاندان کے برسرروزگار لڑکے سے اس کی شادی ہو گئی۔ لڑکے نے کراچی کے ایک انسٹیٹیوٹ سے ہوائی سفر کی ٹکٹنگ کا کورس کیا تھا۔ اسے سعودی ایئرلائنز میں ملازمت مل گئی۔ کچھ دنوں بعد مسرت بھی اپنے میاں کے ساتھ جدہ چلی گئی اور اب ہر سال کراچی آتی ہے--- تین گول مٹول بچوں کی خوش و خرم ماں۔

سلمانہ پھوپھی نے کمال سادگی سے زندگی گزاری۔ اپنے لیے انہوں نے کبھی چاندی کا چھلا بھی نہ بنایا۔ صرف احسن کی شادی پر' احسن کے شدید اصرار پر بری کے زیوروں کے ساتھ انہوں نے اپنے لیے ایک سونے کا لاکٹ بنوایا تھا۔ یہی ان کی کل ذاتی جمع پونجی تھی جو وہ ایک دن بہ خوشی ایم کیو ایم مہاجر قومی موومنٹ--- کو دے دیں گی۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

1965ء میں سراج--- جو ایک رات پی آئی بی کالونی میں کھڑا بجلی کا کھمبا بجا کر شمال مغربی سرحدی صوبے سے لائے گئے جشن فتح منانے والوں کے حملے سے اس مہاجر بستی کے بچاؤ کے لیے پہرہ دے رہا ہے اور دریچے میں کھڑی مسرت سے معاشقہ لڑا رہا ہے اور جو مسرت سے شادی نہیں کرے گا اور سی ایس پی افسر بن کر آنے والے برسوں میں ڈپٹی کمشنر تعینات

ہو گا--- اس وقت یہ بالکل نہیں جانتا کہ جنرل ایوب کی مخالفت کرنے والوں میں صرف کراچی کے اردو بولنے والے ہی نہیں' اس سے بہت دور' اندرون سندھ میں' شہداد کوٹ کے پاس ایک گمنام گاؤں میں رہنے والا اللہ ورایو بھی ان میں شامل ہے۔

اللہ ورایو ایک اسکول ٹیچر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ صاحب ڈنو حیدر آباد کے نور محمد ہائی سکول میں سندھی پڑھاتا تھا۔ وہ عمر بھر حیدر آباد میں رہا اور صرف کبھی کبھی اسکول کی سالانہ تعطیلات میں گاؤں آتا۔ یہ خبریں گاؤں تک اڑتی اڑتی پہنچی تھیں کہ حیدر آباد میں صاحب ڈنو نے ایک ہندوستانی سہیلی کر لی ہے لیکن اس سے صاحب ڈنو کی کوئی اولاد بہرحال نہ تھی۔

اللہ ورایو کی ماں کبھی حیدر آباد نہ گئی' کچے مکان میں چھاج پھٹکتی' چکی پیستی' دودھ بلوتی شاہ بی بی سر پر کپڑے کی ایک دھجی کس کر باندھے سر اور نظریں جھکائے زندگی گزارتی رہی اور مٹی کے چولہے پر چاول کی سرخ روٹیاں سینک کر اللہ ورایو کو کھلاتی رہی۔

لیکن 1965ء میں صاحب ڈنو ریٹائر ہو کر گاؤں آ پڑا ہے۔ سرطان اس کی آنتیں کھا رہا ہے۔ وہ چارپائی سے لگا اپنے شیرخوار پوتے سے کھیلتا ہے اور اللہ ورایو کو گالیاں دیتا ہے۔ (سترہ برس کی عمر میں اللہ ورایو کی شادی کر دی گئی تھی۔ آنے والے برسوں میں وہ چار بچے اور پیدا کرے گا۔ اللہ ورایو کو کبھی ملازمت نہیں ملے گی۔)

صاحب ڈنو جنرل ایوب خاں کے حق میں ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "اڑے پہلی بار تو ان مکڑوں (مہاجروں) کی کسی نے خبر لی ہے۔ اڑے خدا کی مار--- یہ تو ایک ٹڈی دل ہے' آیا اور سب کچھ کھا گیا۔"

لیکن باپ کی ڈانٹ سے بے نیاز اللہ ورایو جنرل ایوب کی مخالف فاطمہ جناح کے انتخابی نشان لالٹین کے پوسٹر گاؤں بھر میں لگاتا پھر رہا ہے۔ کیوں بھلا؟ ایسی اس کی پارٹی کی مرضی ہے' جی ہاں' آپ کی جانی پہچانی ہمیشہ معتوب (ہمیشہ زیرزمین) کمیونسٹ پارٹی کی۔

چار کتابیں سندھی' دس بارہ اردو اور ایک دو انگریزی کی پڑھ کر اللہ ورایو انقلابی ہو گئے ہیں۔ گاؤں کے اجتماعات میں وہ سندھی مصلح اور انقلابی حیدر بخش جتوئی کے زرعی سدھار کے حق میں تقریریں کرتا ہے اور گو ان جلسوں میں وہ اپنی گونجدار سریلی آواز میں سندھ کا مقبول گیت "سندھی بولی قومی بولی" گاتا ہے مگر "قومی سوال" کو لینن کے اس موضوع پر مضمون' جمہوریت' آمریت' فوجی راج مردہ باد اور سامراج وغیرہ کے تانے بانے میں کہیں گندھا ہوا دیکھتا ہے۔

آنے والے برسوں میں پمفلٹ بانٹنے کے معمولی سے جرم پر گرفتار ہونے والے اور "کمیونسٹ" کا ٹھپا لگ جانے کے بعد اللہ ورایو کی قسمت پر مہر لگ جائے گی' اسے کہیں نوکری نہیں مل سکے گی۔

برس بعد برس' بچوں کو بھوک سے بلکتا دیکھتے رہنے پر' دھیرے دھیرے انقلابی سے صرف ایک بے روزگار شخص میں تبدیل ہونے اور در در کی ٹھوکریں کھاتے رہنے پر اللہ ورایو نے شہداد کوٹ کے ایک کچے مکان میں گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔

یہ خبر حیدر آباد اور کراچی پہنچی تو پارٹی کے لوگ سکتے میں آ گئے۔ (کیوں؟ کیا وہ اس کی بے روزگاری اور بدحالی کی انتہا سے بے خبر تھے؟--- مگر وہ خود مستقل مار کھاتے رہتے تھے۔ بس وہ یوں ہی سکتے میں آ گئے' کیونکہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔) پھر انہوں نے کچھ رقم جمع کر کے اللہ ورایو کی بیوہ اور بچوں کو بھجوائی جو ان تک کبھی نہیں پہنچی۔ جواں مرگ سندھی انقلابی کی بیوہ اپنے بچوں سمیت اس کچے مکان سے کہیں جا چکی تھی۔ اس کے سخت سے پردہ دار میکے میں اسے پھر کوئی تلاش نہ کر سکا۔

شہداد کوٹ میں کہیں دفن ہے اللہ ورایو--- سوندھی مٹی سے گھڑا پتلا' مٹی کی امانت' مٹی کے حوالے۔

اللہ ورایو جو کبھی کراچی نہیں آیا' ایک سندھی نوجوان اپنے لب پر ایک گیت اور آنکھوں میں ایک خواب لیے ایک بے روزگار سندھی جو زندگی کے آدھے راستے میں ختم ہو گیا--- تو اس کا ذکر اس داستان میں کیوں کیا جا رہا ہے؟

یہ ذکر تو بس یوں ہی کیا جا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی تھا۔ وقت کے ان برسوں پر محیط دورانیئے میں جہاں انسانوں کے سمندر میں تموج آتا ہے' تحریکوں کی لہریں اٹھتی ہیں اللہ ورایو زمین کا فرزند' مٹی اور پانی سے نمو اور آس پاس کی فضا سے رنگ و بو حاصل کرتے پودے کی مانند اٹھا اور کسی ڈپٹی کمشنر کے لاپروائی سے جاری کیئے حکم نامے کی جھپیٹ میں آ کر سزایافتہ اور روزگار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر مرجھایا اور خاک میں مل گیا۔ اپنی مہک' اپنے گیت اور اپنے خواب سمیت' سپرد خاک!

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

شاعر اور تاریخ

کراچی میں لالو کھیت اور گولی مار کی جھگیوں میں بسے مہاجرین (جو اس وقت صرف غریب غربا کہلاتے تھے) کے قتل عام پر جب فیض صاحب نے یہ نظم لکھی تھی جس میں اس لہو کے بارے میں یہ مصرعے بھی تھے۔

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا

اس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ آنے والے برسوں میں یہ لہو ایک پرچم--- ایم کیو ایم کے پرچم--- پر رقم ہو گا۔

شاعر تاریخ کو مستقبل میں غیر متوقع موڑ کھاتے سفر میں نہیں دیکھتا۔ وہ تو حال کے ایک لمحے میں آنسو بہاتے ہوئے' کرب کے عالم میں شعر جوڑتا ہے۔

مثلاً وہ مجمعے پر پولیس کی فائرنگ پر نظم لکھ دیتا ہے۔

شاعر تاریخ کے متوازی ایک لکیر کھینچتا ہے' متبادل امکانات کی لکیر۔

وقت کے بے شعور' اندھے ریلے میں شاعر اکیلا ہے۔ شاعر تاریخ نہیں' وہ اپنے شعور سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ شاید اسی لیے وہ تاریخ کے لیے بے مصرف نہیں ہو سکتا۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

آؤ بھاگ چلیں

جہانگیر روڈ پر ٹیوشن سنٹر کے پاس یوسف کو بس اسٹاپ پر کھڑی رنگین آنچل لہراتی اور خوشبوئیں لٹاتی سلونی لڑکیوں کو چھیڑتے دیکھ کر سلمانہ پھوپھی اسے ڈانٹتی ہیں۔

"ارے خوش بخت! کیوں خاندان کے نام میں بٹا لگا رہا ہے!"

کان دبائے ہنس کر بھاگتے یوسف کے کنبے کو سلمانہ پھوپھی آگرے سے جانتی ہیں۔ کئی بہنوں کا اکیلا' اس لیے لاڈلا بھائی یوسف بہنوئیوں کی زبان میں "آوارہ" ہو گیا ہے۔ یوسف کی اماں ملال سے کہتیں۔ نگوڑے کو فلم لائن میں جانے کا شوق چرایا ہے۔ "آگرے کے ایک پٹھان خانوادے کا چلبلا نوجوان جو اتنا خوبرو پرکشش تیز طرار اور منچلا ہے کہ جہانگیر روڈ کی کوئی بھنگن بہشتن اس سے چھوٹی نہیں ہے اور نہ کوئی لونڈا۔ وہ چوطرفہ معاشقے لڑاتا ہے اور ان کے قصے یار دوستوں کو ہنس ہنس کر سناتا ہے۔

سب سے زیادہ مشکل اسے جہانگیر روڈ کے پاس ایک پرانی بلڈنگ کے بالائی فلیٹ میں رہنے والی میمن حسینہ کلثوم سے عشق میں پیش آئی تھی۔ کیسی گدگدی تھی گوری گوری کلثوم... ناک میں ہیرے کی کیل' بڑی بڑی بھوری آنکھیں۔ کبھی کبھی سیڑھیوں کی تاریکی میں اس کے گدرائے بدن کو خوب سا بھینچنے کا موقع ملتا' زیادہ تر تو بچاری خط و کتابت پر گزارا کرتی جو وہ ڈلیا میں رکھ کر سبزی لینے کے بہانے بالکنی سے نیچے اتارتی تھی۔ نیچے کھڑا' جانے کب سے آلو ٹماٹر اٹھائے انتظار کرتا یوسف جھٹ سے خط اٹھا لیتا اور آلو یا گوبھی یا بینگن اپنے خط سمیت ڈلیا میں رکھ دیتا۔

ایک دفعہ اس کا ایک خط پکڑا گیا۔ بھولے سے یوسف نے کلثوم کا خط اسکول کی کاپی میں

رکھ دیا تھا۔ یوسف کے بہنوئی نے میز پر رکھی کاپی اٹھائی تو خط فرش پر جا پڑا۔ انہوں نے خط پڑھا تو گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ جو کچھ اس خط کی ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھا تھا اس میں کہیں بھاگ چلنے کا بھی ذکر تھا۔

"اے مردود! لڑکی بھگا رہا ہے!"

یوسف کے بڑے بہنوئی نے اس رات جوان جہان لڑکے کو الٹا لٹا کر چھڑی سے اس کی خوب مرمت کی۔ یوسف کے کسرتی' دودھ ملائی پر پلے جوان بدن پر چھڑیوں کا کیا اثر ہوتا۔ بعد میں وہ اپنی بہن کے پیٹ میں منہ گھسیڑ گھسیڑ کر ہنستا رہا۔

"اے چل ہٹ' بے شرم" یوسف کی بہن نے باریک چھالیا کترتے اور اسے پرے دھکیلتے ہوئے نہایت دکھ سے کہا۔ "وہ تو وقت پر پتا چل گیا ورنہ تو نے تو ہم سب کو تھانے میں بند ھوا ہی دیا تھا۔"

ڈھیٹ یوسف پھر ان کے پیٹ میں منہ گھسیڑ کر ہنسا اور ان کے کوسنے سنتا رہا۔ پھر اس نے بتایا۔

"آپ کے سر کی قسم آپا' میرا کلثوم کو بھگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بھلا یہ علت میں کیوں پالوں گا؟ اس بیچاری نے تو مجھ سے باغ میں ملنے کے لیے لکھا ہے۔ اسے اردو ٹھیک سے نہیں آتی۔ باغ کو باگ کہتی اور لکھتی ہے۔"

یوسف کی آپا نے پہلے تو دم بخود ہو کر سر پیٹ لیا۔ پھر تھوڑی دیر تک مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر سروتے کی آڑ لیتے ہوئے بہت دیر تک ہنستی رہیں جس کے بعد انہوں نے کہا۔

"اے ہے! اردو نہیں آتی اللہ ماری کو!"

زبان کے مسئلے سے پیدا ہونے والی اس چھوٹی سی الجھن کے سوا یوسف کی زندگی میں سیاست کا سرمو دخل نہ تھا۔

اس کی بہنوں کی آرزو تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے مگر یوسف نے پڑھ کر نہ دیا۔ عرصے تک رسیاں تڑانے کی کوشش کرتا یوسف آخرکار لاہور بھاگ گیا تھا۔ وہاں اس کی ہیرو بننے کی خواہش تو پوری نہ ہو پائی تھی مگر اس نے لاہور کی فلمی دنیا میں گھسنے کا ایک دوسرا راستہ تلاش کر لیا تھا اور ہدایت کار شوکت حسین رضوی کی ٹیم میں شامل ہو گیا تھا۔ لاہور جا کر اس نے اپنا نام یوسف حسین زیدی رکھ لیا تھا۔ ہوشیاری کے کسی پیچیدہ چکر میں اس نے اپنے آپ کو

شیعہ ظاہر کیا تھا' ہو سکتا ہے کہ اس بات نے بالواسطہ اس خاص گروپ میں شامل ہونے میں اس کی مدد کی بھی ہو کیونکہ شوکت حسین رضوی شیعہ تھے۔

لاہور میں یوسف کی شادی ہو گئی تھی۔ دراصل شادی اسے کرنی پڑی تھی۔ لاہور پہنچ کر اس نے اپنے خاندان کے قدیمی ملازم کا پتہ لگایا تھا جو وہاں ریلوے میں ملازمت کر رہا تھا اور ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ یوسف نے اس کے گھر ڈیرا ڈال دیا جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا مگر کچھ عرصے بعد جب یوسف کی سرمستیوں نے اس کی بیٹی کا پاؤں بھاری کر دیا تو رانگڑ بچے نے ایک رات قاضی بلا کر یوسف کی کنپٹی پر پستول رکھی اور چھوہارے تقسیم کئے۔ شادی کی خبر جب کراچی پہنچی تو کنبے میں کہرام مچ گیا۔ "رجب علی خاں کے اکلوتے وارث کی شادی نوکر زادی سے!"

نوکر زادی نے (جو بعد میں شمو چچی کہلائیں) یوسف کا بڑا ساتھ دیا۔ چند برس بعد یوسف رلتا کھلتا اس وقت کے مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ چلا گیا تھا۔ ملک کے اس حصے کی علیحدگی کے بعد یوسف کراچی اس حالت میں پہنچا کہ کسی حادثے میں اس کا چہرہ جو کبھی نہایت پرکشش اور وجیہہ تھا جھلس گیا تھا۔ اس کے ساتھ متعدد بنگالی نژاد اولادیں تھیں۔ ان میں سے دو کی ماں' ایک دلفریب بنگالن' ان کے ساتھ آئی تھی۔ مگر کچھ مہینے بعد اسے کوئی اور لے اڑا۔

بنگالن کی رخصتی کے بعد شمو چچی نے آنسو بہاتے اور پونچھتے ہوئے سب بچوں کو سمیٹ کر کراچی کی ایک نئی بستی میں گھر بسالیا۔

اس دوران یوسف کے تمام رشتے دار جہانگیر روڈ کے کوارٹروں سے اٹھ کر ناظم آباد اور ہاؤسنگ سوسائٹی منتقل ہو چکے تھے۔ ان کی ایک بھانجی کے ڈاکٹر شوہر نے ممیا سر کو اپنے دواخانے میں بٹھا دیا۔ چند مہینوں میں دواؤں کی شدبد حاصل کرنے اور انجکشن لگانا سیکھنے کے بعد یوسف نے ایک قبضہ کیئے ہوئے ادھ بنے مکان میں کلینک کھول کر "ڈاکٹر یوسف علی خاں" کی تختی آویزاں کر دی اور محلے والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں مصروف ہو گئے۔

زندگی میں پہلی بار انہیں سیاسی جماعتوں میں شمولیت کے اقتصادی اور سماجی فوائد کا احساس ہوا تھا۔ مگر یوسف--- اب ڈاکٹر یوسف علی خاں--- کی ایم کیو ایم میں شمولیت پر کسی نے غور تک نہ کیا تھا' کیونکہ پورا محلہ' پورا ضلع' پورا شہر ایم کیو ایم میں یوں بھی شامل ہو چکا تھا۔

قوم یا قومیت کا تصور بھی یوسف میاں کے ذہن میں کچھ الجھ الجھ سا جاتا۔ سخت زندگی گزارنے کے بعد آیا بڑھاپا انہیں بار بار بیمار بھی ڈال دیتا۔ وہ چڑچڑاتے' پلنگ پر پڑے پڑے ہنکارتے۔

"قوموں میں قوم تو پٹھان تھی۔ (یعنی آگرے کے پٹھان) ارے یہ مغل--- یہ مغل تو نامرد تھے۔ زوجاؤں کے پاس خود تو پھٹکتے بھی نہ تھے۔ ارے ہم جانتے ہیں! ان کی عورتیں تو--- ارے موسلوں کے ساتھ جاتی تھیں--- بھائی ہاتھیوں کے ساتھ جاتی تھیں--- سنتی ہو شمو؟" وہ چلاتے۔

دور کھری چارپائی پر پرانے کپڑے پھیلائے چھوٹے کپڑوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا بنانے کی مہم میں غرق شمو چچی بے خیالی میں قینچی چلاتے ہوئے کہتیں۔ "اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے--- یا مولا مشکل کشا!" اور کترنیں بیونتنے میں مصروف رہتیں۔

جوانی کے اندر مہاراج یوسف میاں پر تیزی سے جھپٹا مار تا بڑھاپا ان کے قویٰ کو مضمحل کر رہا تھا۔ وہ موسلوں اور ہاتھیوں کا تصور کرتے اور بدبخت مغل عورتوں کی متصورہ جسارتوں پر دانت پیس پیس کر کچکچاتے یوسف میاں شمو چچی کی بے خیالی پر اور بھی جھنجلاتے۔ "کچھ سنتی تو ہے نہیں' کم عقل!" وہ بڑبڑاتے اور سخت روئی کے تکئے پر دائیں بائیں سر پٹکتے۔ پھر لوٹ پوٹ کر آپ ہی آپ ٹھیک بھی ہو جاتے اور اپنا مطب چلانے لگتے۔

1988ء میں یوسف خواجہ اجمیر نگری کے پٹھان مہاجر فسادات کے دوران چھاتی میں گولی لگنے سے ہلاک ہو گئے۔ انہیں عباسی شہید ہسپتال لایا گیا تھا۔ مرنے سے پہلے یوسف نے آنکھیں کھول کر پاس کھڑے کسی بنگالن کی کوکھ سے جنمے' جوان بیٹے کو غور سے دیکھا تھا اور ایک لطیف کہر آلود راستے سے گزرتے ہوئے ہنس کر بدلی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"آؤ بھاگ چلیں!"

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

اس ہسپتال میں احسن نہیں ہے۔ احسن نے کامرس میں گریجوایشن کیا تھا اور اسے ایک بینک میں نوکری بھی مل گئی تھی۔ مگر بینکوں کے قومیائے جانے کے بعد سفارشی بھرتی پر اپنے اوپر تعینات کئے گئے ان پڑھ افسر سے بددل ہو کر اس نے خاموشی سے کمپیوٹر کی مرمت کا کورس کیا۔ (کسی بھی قسم کی محنت کو وہ یوں بھی برا نہیں سمجھتا تھا) اور تین ساتھیوں کے ساتھ

مل کر گلشن اقبال میں ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کر لیا۔ احسن کے ساجھے دار یہاں شام کو کمپیوٹر پروگرامنگ کی کلاسیں لیتے ہیں۔ احسن اور اس کے تینوں ساتھی ایم کیو ایم کے پکے حامی ہیں اور گو وہ اس کے کسی عہدیدار سے زندگی میں کبھی ملے تک نہیں ہیں مگر وہ ہر بار اسی کو ووٹ دیں گے' اس جماعت کو جس نے ان کے خیال میں انہیں ایک تشخص' ایک اپنائیت کا احساس دیا ہے' جو انہیں کسی دوسری جماعت سے نہ مل سکا تھا۔

اور نعیم ہماری داستان کا وہ سات آٹھ سالہ بچہ کہاں گیا جو برسوں پہلے ایک ہلچل بھری رات میں پی آئی بی کالونی کا کھمبا بجانا چاہتا تھا؟

نعیم ہمیشہ حیدر آباد میں نہیں رہا۔ 1969ء میں شہر سے دور جام شورو منتقل کی جانے والی سندھ یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات میں داخلے کا فارم بھرنے کی کوشش میں پتلون اتارے جانے کے بعد--- جبکہ اس کے مقعد میں دو تین گلابی صحت مند عضوہائے تناسل طاقت ور دھکوں کے ساتھ گھسنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے سر پر "جئے سندھ" کے نعرے گونج رہے تھے--- روتے ہوئے اور سرپٹکتے ہوئے اس نے کراچی چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور حیدر آباد کے ان گنت خاندانوں کی طرح اس کا خاندان بھی کراچی آ کر بس گیا تھا۔

کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے نعیم ٹورانٹو' اوٹاوا یا واشنگٹن چلا گیا' جہاں وہ خوشحال ہے اور اچھا کھاتا کماتا ہے۔ آپ اس بات پر متعجب نہ ہوں کہ وہ ٹورانٹو یا اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں ایم کیو ایم کا یونٹ صدر ہے۔

برسوں بعد آپ کا وہاں سے گزر ہو گا۔ ایم کیو ایم کے ٹورانٹو' اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں اس جواں سال' ہنس مکھ بزنس ایگزیکٹو اور ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کے گھر کے گول کمرے میں ہالہ کی منقش سندھی پیڑھیاں اور دیوار پر آرائش کے لیے لگائی سندھی اجرک آویزاں دیکھ کر آپ خاموشی سے آنکھیں پھیر لیں گے اور ایک بھی آنسو نہ گرانا چاہیں گے۔ آپ ان آنسوؤں کو واپس اپنے دل میں دھکیل دینا چاہیں گے۔ آپ اس پہیلی کا بھی کوئی حل معلوم نہ کرنا چاہیں گے کہ جبکہ بالائی سطح پر "میرا کلچر" اور "تیرا کلچر" کی گالم گلوچ اور نفرت بھری بحث جاری ہے' نیچے کہیں پاتال میں' انجانے میں' مہاجروں کے وجود کا تہذیبی پہلو سندھ کے رنگ میں رنگ چکا ہے اور یہ کہ پردیس میں وطن کی تہذیب کے نام پر ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کو صرف ہالہ کی منقش پیڑھی اور سندھی اجرک ہی کا خیال آتا ہے۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

مہاجر قومی موومنٹ

نچلے اور درمیانہ مہاجر طبقوں کے اس جم غفیر نے آخر کار اپنی نمائندہ' نسلی نام رکھنے والی' سیاسی تنظیم بنالی اور ایسے کہ کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ شاہراہوں پر رواں انسانوں کا سمندر' گلی کوچوں سے ابلتا ہوا---

یہ کس قسم کی تحریک تھی؟

یہ اپنے طبقے اور ان حالات کی آئینہ دار ہی ہو سکتی تھی جن میں یہ وجود میں آئی۔ اس کی ناخوشگوار خصوصیات کرسی اقتدار کی نگرانی میں پیدا ہوئیں تاکہ وقت ضرورت کام میں لائی جا سکیں۔ اختلاف رائے برداشت کرنا اس کی خصوصیت نہ تھی مگر اس سے ٹوٹے ہوئے گروہ کو پالنا پوسنا تاکہ وقت ضرورت (اب کی بار خود اس کے خلاف) استعمال میں لایا جا سکے' اس کے خوف اور احساس عدم تحفظ کو صرف بڑھا ہی سکتا تھا۔

اس کے وجود میں آنے کے بعد سے اب تک تمام تر انتخابی عمل ثابت کرتا ہے کہ یہ مہاجروں کی نمائندہ اور اپنے لیے منتخب کی ہوئی تنظیم ہے جبکہ علیحدہ کیا ہوا گروہ کوئی قابل ذکر عوامی حمایت نہیں رکھتا۔ ایم کیو ایم گزشتہ کئی برسوں سے عتاب میں ہے مگر ایسا کوئی عوامی اشاریہ موجود نہیں جس سے اس جماعت کی مقبولیت میں کمی نظر آتی ہو۔

ایم کیو ایم اور نواز شریف کی مسلم لیگ کے اتحاد سے قائم کی ہوئی سابقہ صوبائی حکومت کا دور' جس میں انتقام کی آگ میں جھلستے ہوئے پیپلز پارٹی کے ایک منحرف (دراصل ٹھکرائے ہوئے) ممبر جام صادق علی کو سندھ کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا تھا' سندھ میں شدید بدنظمی اور بدامنی ہی کا دور کہا جا سکتا ہے جس سے کراچی بھی مبرا نہ تھا۔ سندھ تو اس حد تک ڈاکوؤں کے قبضے

میں چلا گیا تھا کہ اس کا زرعی نظام تار تار ہو کر قبائلی بلکہ خانہ بدوش دور کی طرف مراجعت کر رہا تھا۔ ہزار برس سے زراعت کرنے والے معاشرے کے کسانوں نے کھیتی باڑی کرنی چھوڑ دی تھی اور تیزی سے ڈاکوؤں کے گروہوں میں شامل ہو رہے تھے۔ اس قسم کی خبریں عام تھیں کہ مثلاً ایک قبیلے کے گاؤں پر دوسرے قبیلے کے افراد کے ڈاکے کے بعد پہلے قبیلے نے پورے سندھ میں ہر جگہ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو قتل کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کراچی میں بھی چوری، ڈکیتی، اغوا برائے تاوان کی وارداتیں انتہائی تواتر سے ہو رہی تھیں۔

آخر اسی دور میں دیہی سندھ میں فوجی مداخلت شروع ہوئی اور ابتدائی اکا دکا غلطیوں کے بعد فوج سندھ کے دیہات کی صورتحال سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کامیابی نے سندھ کے کسانوں کے دل موہ لیے جنہوں نے ملک کی تاریخ میں پہلی بار مسلح افواج کو اپنا ہمدرد، دوست اور خیرخواہ سمجھا۔

لیکن کراچی میں صورتحال کیوں مختلف رہی؟ آپریشن کلین اپ شہر میں سکون اور اطمینان کی ایک بھی سانس لانے میں کیوں ناکام رہا؟ کس لیے یہ شہر آنسوؤں کا، ہر روز اٹھتے جنازوں کا، شک شبے کا، نفرتوں کا شہر بنا رہا؟

شہر کی ایک بڑی سیاسی تنظیم معتوب ہے۔ اس کی بنائی ہوئی اذیت گاہیں ٹیلی ویژن پر دکھائی گئیں۔ انہیں ختم کر دیا گیا۔

شہر کے لوگوں نے خوشیاں نہیں منائیں، منہ لٹکائے پھرتے رہے۔

ہزاروں نفوس پر مشتمل ایک پوری تنظیم زیرِ زمین چلی گئی۔ شہر کی نچلے اور درمیانے طبقے کی آبادیوں نے انہیں اپنے اندر سمو لیا۔

ہزاروں گرفتاریاں ہوئیں۔ شہر میں ہولناک خبریں گشت کرنے لگیں۔ پوچھ گچھ میں لڑکوں کے ہاتھ پیر توڑ دیئے گئے ہیں، ان کی ٹانگیں چیر کر انہیں نامرد کر دیا گیا ہے۔

مہینوں راہ گیروں کو، سڑک پر چلتی موٹر گاڑیوں کو روک روک کر تلاشیاں لی جاتی رہیں گویا دہشت گرد کار کی سیٹ کے نیچے یا بونیٹ میں بند ہیں۔

کراچی ایک ذلیل کیا ہوا شہر بن گیا۔

جلد ہی یہ خبریں عام ہو گئیں کہ امن و امان قائم کرنے والے ادارے اندھا دھند گرفتاریاں کرنے لگے ہیں اور ہزاروں روپے لے کر رہا کرتے ہیں۔ شہر میں جرائم کی وارداتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شہر کے کونوں کھدروں میں لاشیں ملنے لگیں۔ اذیت دے

کر قتل کیے ہوئے لوگوں کی لاشیں۔

آپریشن کلین اپ کے پہلے برس میں شہر سے لڑکے غائب ہونے شروع ہو گئے۔ ان کی عمریں سترہ سے ستائیس برس تک کی بتائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کراچی سے اٹھارہ ہزار لڑکے غائب ہو گئے۔

شاید اٹھارہ ہزار نہ ہوں، شاید یہ مبالغہ ہو۔

شاید نو ہزار ہوں، یا اس سے بھی کم۔

شاید پانچ ہزار ہوں۔

پانچ ہزار جوان لڑکے اپنے گھروں میں نہیں۔ کیا ان کے ماں باپ کو ان کے بارے میں علم ہو گا؟ کیا وہ جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا کہاں ہے؟ کب لوٹ سکے گا؟

جس رات نہیں آتا ہوں میں
اس آنگن میں ہوتا ہے کوئی
اس بستر پر سوتا ہے کوئی
اس کمرے کی دہلیز پہ اپنا سر رکھ کر روتا ہے کوئی

(ساقی فاروقی)

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ مل رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

(حبیب جالب)

پھر محلے محلے کی ناکہ بندی کر کے ہتھیاروں کے لیے گھر گھر تلاشی لی جانے لگی۔

یہ ہتھیار--- برسوں کی مدت میں سرکاری نظروں کے عین سامنے پھیلائے ہوئے ہتھیار--- کسی کو نہ مل سکے! ہتھیار دنیا میں آج تک کہیں بھی برآمد نہیں ہو سکے ہیں۔ ہاں اگر وہ عوامی حمایت ختم ہو جائے جو ان ہتھیاریوں کے استعمال کو جائز سمجھتی ہے تو کسی کے لیے بھی ان کا استعمال کرنا مشکل بن جاتا ہے۔ ہتھیاروں کا استعمال اسی طرح ختم ہو سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں ہم ہتھیار برآمد نہ کر سکے۔ ایک بہت بڑا خون خرابہ کر کے بھی نہیں۔

کراچی--- تیسری دنیا کا ایک شہر' سرد جنگ کے اختتام پر' سرد جنگ کا ملبہ جھیلتا۔ اپنے فائدے میں استعمال کرنے کیلئے ان حکمرانوں کی سرپرستی کا شکار جنہوں نے اپنے معاشرے کی دھجیاں اڑا دیں' ایک ایسی سمجھ بوجھ کو جنم دیا جو منظم طور پر شہریوں کی مجرم سازی کو روا گردانتی ہے' ایسی تدبیروں کو تیر بہدف سمجھ سکتی ہے جن میں شہریوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر بھیڑیوں کی طرح شکار کرنے کیلئے چھوڑ دینا کسی مسئلے کا حل سمجھا جاتا ہے۔

اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ کراچی میں شہریوں کو ذمے دار اداروں کی جانب سے دہشت گردوں سے خود نمٹنے کے لیے ہتھیاروں کی پیشکش کی گئی ہے' یہ سوچے بغیر کہ ان کا دیا ہوا ہر ہتھیار ایک نیا قاتل پیدا کرے گا۔

اس شہر میں کسی اسٹیج ڈرامے کی مانند کثیرالتعداد قتل کیئے گئے ہیں۔ شہر کے خونیں چیستان میں شیعہ سنی مساجد میں قتل اسی نوعیت کی وارداتیں ہیں' کیونکہ شہر میں کوئی شیعہ سنی تضاد موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عالمی ذرائع ابلاغ بھی اس حد تک گمراہ ہوئے ہیں کہ مساجد میں قتل کی ان پراسرار وارداتوں کو "سیکٹرین کلیش" کا نام دیتے رہے ہیں۔

ایم کیو ایم کی تنظیم جو اپنے طبقاتی مزاج اور اپنے وقت اور اس پورے (سیاسی' معاشرتی) پس منظر کی عکاس ہے جس میں یہ وجود میں آئی۔ اگر آپ اس کا سر دیوار سے دے ماریں اور زہریلی' پھنکارتی سرگوشی میں کہیں۔

"کس کے مشورے پر پارٹی بنائی تھی؟ ایجنسیوں کے مشورے پر؟"

(سٹی کورٹ کے سامنے دبلے پتلے مہاجر لڑکوں کا گروہ بڑبڑایا۔ "ایجنسیوں سے ملتے ہو؟ ایجنسیوں کی آدمی ہو؟ انہوں نے عظیم طارق کی ٹائی پر' اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔)

تو سننے والے کا چہرہ تمتما سکتا ہے۔ وہ پوچھ سکتا ہے۔ "انڈین نیشنل کانگریس کس نے بنوائی تھی؟ مسلم لیگ کس نے بنوائی تھی؟ انگریزوں نے؟" بلکہ شاید وہ ہکلاتے ہوئے یہ بھی پوچھ بیٹھے۔ "پی پی پی کس نے بنوائی تھی؟ امریکنوں نے؟ جنہیں خوش کرنے کے لیے آپ کے بھ--- بھ--- بھٹو صاحب نے معاہدہ تاشقند کی مخالفت کی تھی؟" امریکہ کی مرضی تھی کہ اب ایوب خاں کو ہٹایا جائے مگر ان سب سیاسی جماعتوں کی اس وقت ضرورت بھی تھی--- عوامی ضرورت--- اسی لیے یہ بن کر اس قدر کامیاب رہیں۔

اس تنظیم کو--- لاکھوں عام شہریوں کی نمائندہ تنظیم کو--- کن قوتوں نے اذیت گاہوں کے قیام سے' قتل سے' خون سے' ہتھیاروں سے داغدار کیا؟ اور لوگ اب بھی اسے کیوں

نہیں چھوڑتے؟

کراچی میں اس جماعت کے قائم کیئے ہوئے اذیت خانوں کے دوش بدوش سرکاری' قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اذیت خانے بھی تھے جہاں اس وقت کی معتوب پیپلزپارٹی کی نوجوان لڑکیوں کو ننگا کر کے ان کے نازک اعضا میں بجلی کے تاروں سے جھٹکے دیئے جا رہے تھے۔ اس شہر میں ایک وقت تھا کہ معتوب پیپلزپارٹی کے لوگ رات بھر سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

پھر یہاں ایم کیو ایم کرسیوں پر بٹھائی گئی' گو اسے فیتے کاٹنے اور لوگوں سے ہاتھ ملانے کے علاوہ شہر یا صوبے یا ملک کے اہم معاملات کو اپنی سمجھ بوجھ سے حل کرنے کا اختیار نہ تھا۔

انہیں جلوس نکالنے کا اختیار تھا' سو انہوں نے فقیدالمثال جلوس نکالے۔ انہیں بدعنوانیوں کا اختیار تھا (یہ اختیار یہاں سب کو دے دیا جاتا ہے) سو ان کے ہتھیار بند اسکوٹر سوار لڑکے (جنہیں سرکاری نگرانی میں برسوں سے ہتھیار بند بنایا جاتا رہا تھا) بھتہ وصول کرنے لگے۔

انہیں قابو میں کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والے ہتھیار بند اداروں کو تعینات کیا گیا۔ نہایت قلیل عرصے میں وہ بھی بھتہ وصول کرنے لگے۔

کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟ اور وہ کیا سچ ہے جو لکھا نہیں جا سکتا؟ عورت سوچتی ہے۔

یہ لکھا جاتا رہا ہے اور لکھا جا سکتا ہے کہ برسوں سے ظلم' دھونس اور سیاسی مخالفوں کو کچلنے کے لیے استعمال کیئے جانے والے ریاستی ادارے اس قدر کھوکھلے ہو چکے ہیں کہ بحرانی صورتحال میں ان کا اوپری خول تک نظر نہیں آ سکتا۔ مزید برآں ان بری طرح ناکارہ' ریاست کے دیمک چاٹے ہوئے اعضائے کار کے ذریعے ظلم' خونریزی اور دھونس کا خاتمہ مزید ظلم' خونریزی اور دھونس کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا' خصوصاً شہر کی اکثریتی آبادی کے تعاون کے بغیر تو ہرگز نہیں۔ یہ حکمت عملی صرف گزشتہ دہشت گردی کو تازہ دہشت گردی سے غلط ملط کر کے جرائم اور خونریزی کی گتھی کو اور بھی مضبوط' کھولی نہ جا سکنے والی گرہ میں تبدیل کرنے پر قادر ہے--- اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔

کراچی میں آپریشن کلین اپ اسی لیے کامیاب نہیں ہوا۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

خون کی بو چھاڑ میں

چلچلاتی دھوپ میں اور ایسی گرمی میں کہ چیل گھونسلے میں انڈا چھوڑے' کراچی کے نواح میں مگرمچھوں کے تالاب کے پاس سناٹا ہے۔ سفید آسمان پر دور دور تک کوئی پرندہ اڑتا نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھار چلنے والے لو کے گرم تھپیڑے سے تالاب کے کنارے اگے سوکھے' خوآکستری ببول اور جھاڑ جھنکاڑ ایک جانب کو زور سے طمانچہ کھاتے آدمی کی طرح جھک جاتے ہیں۔ دور دور تک نہ آدم ہے نہ آدم زاد' نہ کوئی اور جاندار نظر آرہا ہے۔ حتیٰ کہ مگرمچھ بھی سوکھے پتوں اور گھاس پھوس سے بھرے تالاب کی تہہ لینے کے لیے اپنی خاکی سبز تھوتھنیاں پانی سے نکال کر بڑی بڑی نیم خوابیدہ آنکھوں سے چہار سو پھیلی ویرانی پر نظر ڈالتے ہیں اور سستی سے دوبارہ غڑاپ کی آواز کے ساتھ تھوتھنیاں اندر کر لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسے گویا فطرت نے اپنے خاص الخاص موقلم سے کراچی کے جاری شب و روز کے پس منظر کے طور پر بنایا ہو۔

تالاب کا سبز کاہی پانی بالکل خاموش ہے۔ دفعتاً" خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ چادر آب عین وسط سے چاک ہوتی ہے اور اس میں سے ایک پیر فرتوت برآمد ہوتا ہے۔ آن کی آن میں وہ بالوں سے پانی جھٹکتا چلچلاتی دھوپ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھتا ہے۔

جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک بڑھیا نکلتی ہے۔ اس کی کمر خمیدہ ہے اور تار تار لباس میلا اور پیوندوں سے بھرا ہوا ہے۔ مچی مچی آنکھوں سے وہ زمین پر کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ دراصل روشنی اتنی زیادہ ہے کہ اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا۔

معاً تڑخی ہوئی زمین پھٹی اور چار کالے کالے ننھے منے بھتنے پھدک کر باہر آگئے۔ وہ

بالکل مٹی کے پتلے لگ رہے ہیں۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں چمکاتے وہ ایک گھیرے میں بڑھیا کے اطراف قہقہے لگا لگا کر ناچنے اور گانے لگے۔

"بڑھیا ری بڑھیا تو کیا ڈھونڈے' خون کی بو چھاڑ میں؟"

بڑھیا نے کہا۔

"بچورے بچو میں سوئی ڈھونڈوں' خون کی بو چھاڑ میں۔"

بھتنے۔ "سوئی سے کیا کرے گی' خون کی بو چھاڑ میں؟"

بڑھیا۔ "سوئی سے تھیلی سیئوں گی' خون کی بو چھاڑ میں۔"

بھتنے۔ "تھیلی میں کیا رکھے گی' خون کی بو چھاڑ میں؟"

بڑھیا۔ "تھیلی میں روپیہ رکھوں گی' خون کی بو چھاڑ میں' خون کی بو چھاڑ میں' خون کی بو چھاڑ میں---"

بھتنے یہ سن کر غائب ہو گئے۔ اب بڑھیا پیر فرتوت کی جانب متوجہ ہوئی۔ نہ جانے اسے سوئی ملی یا نہیں! شاید ایک زنگ آلود سوئی مل تو گئی تھی جسے اس نے اپنے لباس میں اڑس لیا تھا۔ بڑھیا پیر فرتوت کے پاس آئی جو اب ایک گلاس سے کوئی مشروب پی رہا تھا۔ بڑھیا نے اپنا بایاں ہاتھ اسے دکھا کر پوچھا۔

"کیوں بڑے میاں' میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟"

بڑے میاں نے کھنکھار کر کہا۔ کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟"

"پیسہ آئے گا' روکڑا؟" بڑھیا نے مضبوطی سے پوچھا۔

بڑے میاں شرمندگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کچھ جھجک کر بولے۔

"یہ کیا پوچھ رہی ہیں آپ؟ آپ تو--- ماشاء اللہ--- ادیبہ ہیں--- عالم فاضل۔"

یہ سن کر بڑھیا پہلے ہنسی اور پھر روئی--- یا شاید وہ پہلے روئی تھی اور پھر ہنسی تھی۔ پھر وہ پیر فرتوت کے پاس اپنی گدڑی بچھا کر بیٹھ گئی اور اس نے بڑے میاں سے کہا۔

چلئے جانے دیجئے--- یہ میرا ذاتی اور قومی معاملہ ہے--- آپ یہ بتایئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے--- کراچی میں؟"

بوڑھا دیر تک سورج کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے یوں آغاز کیا۔

"محترمہ' میں یہ باتیں آپ تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔ خدا معلوم اب میری زندگی اور

کتنے دن کی رہ گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ حقیقت کسی ایسے شخص تک پہنچ جائے جو اسے سمجھ سکے اور محفوظ کر لے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ بے شک--- اس تحریک کی داغ بیل میں نے ڈالی--- اور--- حالانکہ مدت ہوئی میں اس سے جدا ہو چکا ہوں اور تحریک تباہی کی طرف مائل ہے--- پھر بھی میں چند باتوں پر فخر کیوں کرتا ہوں۔"

"بتایئے--- بتایئے۔" عورت نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ اس کے دیدوں کے پیچھے پانی خارج کرنے والے غدود کا سماعت کی نسوں کا ایک غیر معمولی رابطہ اس طرح ہو گیا ہے کہ دو تین برس سے لفظ "کراچی" سنتے ہی یہ غدود متحرک ہو جاتے ہیں اور ڈھیلوں سے پانی جاری ہو جاتا ہے۔

بوڑھے نے بتانا شروع کیا۔

"محترمہ' میں نے اس ملک کی سیاست کے خارزار کے چپے چپے کی دشت نوردی کی ہے۔ برسوں بلکہ عمر بھر اسی صحرا کی خاک چھانی ہے۔ نیپ میں شامل میں رہا' جی ایم سید کے ساتھیوں میں' میں رہا--- اور میں دیکھتا رہا کہ مہاجر من حیث القوم رجعت پرست سیاسی جماعتوں کے ہم نوا رہے۔ ترقی پسند نعرے اجتماعی طور پر انہیں کبھی بھی اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ 1977ء کے انتخابات میں یہ اس نو جماعتی متحدہ محاذ کے ساتھ ہو گئے جسے نو ستارے کہا جاتا تھا---"

عورت کے ذہن میں ایک تصویر تازہ ہو جاتی ہے۔

یہ کراچی ہے۔ شہر کے مغربی مضافات میں پھیلے سائٹ کے صنعتی علاقے کی ایک بلند و بالا کثیرالقومی دوا ساز فیکٹری کے دفتر میں وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ اس دفتر اور کارخانے کا ایک ایک فرد جماعت اسلامی کا حامی ہے۔ لیبارٹری کی طرف جاتی ہوئی دو نوجوان فارماسسٹ لڑکیاں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ وہ خوش ہیں اور ہنس رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کہتی ہے۔ "ہم نے انہیں ہرا دیا۔ بھائی جان کہہ رہے تھے کہ مہاجروں کے دماغ اور پٹھانوں کی جسمانی قوت نے مل کر کام کیا ہے۔"

"اچھا' آخر آپ بھٹو کے خلاف کیوں ہیں؟" عورت نے ایک نوجوان' خوش پوش اور مستعد سیلز ایگزیکٹو سے پوچھا۔

وہ جلدی جلدی اسے سمجھانے لگا۔ "اجی اس وڈیرا گردی سے تنگ ہیں ہم--- یہ جو چلے آتے ہیں--- بھر گئے ہیں شہروں میں--- دیکھیے میڈم' کپڑوں کی دکان پر جا کر دیکھیے---

جس کپڑے کا ایک کوٹ سلوانے کی استطاعت حاصل کرنے کے لیے ہم نے عمر بھر محنت کی ہے اس کے درجنوں سوٹ یہ کس طرح خریدتے ہیں۔

ہوں' تو معاملہ طبقاتی ہے' عورت دل میں سوچتی ہے۔

مگر شہر کے گلی کوچوں میں یہ طبقاتی نفرت لسانی اور نسلی رنگ اختیار کر چکی ہے۔ ولی خان کی قیادت میں کراچی کے پٹھان پیپلز پارٹی کے شدید مخالف بن چکے ہیں۔ سڑک پر سندھی چادر اجرک اوڑھنے والوں کے لیے کوئی رکشہ ٹیکسی نہیں رکتی جسے کوئی پٹھان چلا رہا ہو---

"تو پھر آپ نے کیا کیا؟" عورت پیر فرتوت سے پوچھتی ہے۔

"تو انتخابات کے بعد میں نے سوچا--- کہ لوگوں میں' عوام میں تحرک اندرونی تضادات کو تیز کرنے ہی سے آتا ہے۔ کٹھ ملاؤں سے مہاجروں کی جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے--- مذہبی جنون کے زہر کو قومی عصبیت کا زہر ہی مار سکتا ہے--- لہٰذا میں نے ان نوجوانوں پر توجہ مرکوز کر دی جو کراچی کے گلی کوچوں میں جان ہتھیلی پر رکھ کر جلسے جلوس کرنے' ٹائر جلانے اور پرجوش تقریریں کرنے کے باعث محلوں کے ہیرو بن چکے تھے۔"

عورت کو یاد آتا ہے۔

1977ء کے انتخابات کے بعد' دھاندلی کے الزام میں چلائی ہوئی تحریک--- جلوس پر فوج کی فائرنگ--- پہیہ جام ہڑتال میں ٹرین روکنے کی کوشش--- احمد فراز کی جذباتی نظم۔

پٹڑیوں کی جمی پپڑیاں خون کی
کہہ رہی ہیں کہ منظر قیامت کے ہیں

کراچی کے گھر گھر میں اس نظم کی فوٹو اسٹیٹ نقلیں---

"خیر' تو میں نے ان سے کہا کہ نو ستارے تمہیں استعمال کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کی قیادت کسی مہاجر کے پاس کبھی نہیں آئے گی--- پس تو آخر کار مہاجر طلباء تحریک کا آغاز ہوا اور اس کی رہنمائی میرے ہی محلے کے ایک لڑکے نے کی---

"میں نے ترقی پسند نوجوانوں کو اس طرف لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ انکار کر دیتے تھے۔ کیا مہاجر مہاجر کر رہے ہیں؟ وہ کہتے ہم تو بین الاقوامی' طبقاتی تحریک پر یقین رکھتے ہیں۔ میں ان کو سمجھاتا--- میاں' تحریکیں نیک جذبات پر کامیاب نہیں ہوتیں۔ عوام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑنا ہوتا ہے' کسی زخم کو کریدنا ہوتا ہے۔ بظاہر چاہے وہ گھٹیا سی بات لگے' مگر اس کی آڑ میں بلکہ اس کے سہارے' بڑے بڑے کام کئے جا سکتے ہیں---"

بوڑھے کی بات کی نصف سچائی عورت کے دماغ میں پگھلے سیسے کی طرح اترتی ہے---

"مگر کیا!" بوڑھا کہتا ہے- "پھر آتی ہے تنظیم--- بھئی ہم بیزار تھے پارٹیوں کی بدنظمی سے' ہم نے سوچا کہ تنظیم اتنی مضبوط ہونی چاہیئے کہ کوئی کارکن اپنی جگہ سے ہل نہ سکے- اپنا ہی تصور--- منتخب ممبران اسمبلی اپنے گھر نہیں جا سکتے' اب وہ صرف تحریک کے لیے وقف ہو چکے ہیں- ان کے گھر والوں پر بھی نظر رکھی جائے گی- اگر منتخب نمائندہ گمراہ ہو جائے تو اس کے خاندان والوں کی خیر نہیں- انا کو توڑا جائے---"

طبقاتی نفرت کا ایک مظہر--- جو کسی کی سمجھ میں آنے سے پہلے زیادہ تعلیم یافتہ' زیادہ مہذب' مہاجر افراد سے بھی نفرت میں تبدیل ہو گیا- ایک چھوٹے سے گھر میں مرغا بنے ہوئے' الٹے لٹکے ہوئے لوگ---

"انا کو توڑو؟"

"کیوں؟ کیا چین میں ماؤ نے محنت کش طبقے سے نہیں کہا تھا کہ ان بڈھے رجعتی پروفیسروں کے سر پر جوتے مار مار کر ان کے فلسفے کی ہوا نکالو؟" بوڑھا ہنستا ہے- اب وہ دوسرا گلاس بھر رہا ہے- "بھول گئیں چین کا ثقافتی انقلاب؟"

مہاجروں کو سب سے زیادہ ناز اس پر تھا کہ وہ پاکستان بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں- ان میں پڑھے لکھوں کی شرح فی الحقیقت دوسری تہذیبی اکائیوں سے بڑھ کر تھی-

اور تحریک نے ان کی ایک پوری نوجوان نسل کو تعلیم سے بے گانہ کر دیا--- وہ جاہل ہو گئے- صرف نعرہ بازی' جلسے جلوس میں مشغول' جیسے مہاجر!

بوڑھا گلاس سے چسکی بھرتا ہے- "کلچرل ریوولیوشن کے دوران چائنا میں بھی یہی ہوا تھا- برسوں قوم کی قوم پڑھنے لکھنے یا کوئی بھی پیداواری کام کرنے کی جگہ ڈنڈے بجاتی گھومتی رہی تھی--- اسی لیے بعد میں ملک میں اتنا بڑا قحط پڑا تھا-"

مہاجروں کو دوسری سیاسی جماعتوں پر اعتراض تھا کہ ان کی قیادت وڈیروں اور پیروں کے ہاتھ میں ہے-

تحریک کے اپنے قائد وڈیرے تو خیر نہ بن سکے مگر اس شہری' تعلیم یافتہ' روشن خیال جماعت کے سربراہ سرعت سے پیر بن گئے- پاکستان کے اس جدید ترین شہر کے اندرونی گلی کوچوں میں پتوں پھولوں اور پتھروں میں ان کی مبارک شبیہہ نمودار ہونے لگی-

اور لاکھوں پڑھے لکھے' روشن خیال مہاجر ان باتوں کو یکسوئی کے ساتھ نظرانداز کرتے

رہے-

رنچھوڑ لائن کے ایک شکستہ' تنگ و تاریک مکان کے صحن میں ایک جنازہ تیار رکھا ہے- اندر سے آہ و بکا کی آوازیں آ رہی ہیں- پانچ چھوٹے بچے ڈبڈبائی آنکھوں سے کھڑکیوں کے باہر جھانک رہے ہیں- صحن میں عزاداروں کا ہجوم ہے- ان میں سے ایک جو مرنے والے کا دوست ہے اس کے بڑے بیٹے کو گلے سے لگا کر بھرائی آواز میں کہتا ہے- "صبر کرو میرے بیٹے--- اور یہ نہ بھولو کہ اب اس خاندان کے والی وارث تم ہو--- تم اب میڈیکل کی پڑھائی جاری نہ رکھ سکو گے- تم کل ہی میرے پاس آؤ' میں تمہیں نوکری دلا دوں گا-"

1954ء میں ایک سو اسی روپے ماہوار کی نوکری سے بالغ زندگی کا آغاز کرنے والا یہ لڑکا--- سن نوے یا اکانوے یا چورانوے میں اپنے ادارے کے اعلیٰ ترین افسروں میں شامل دیس دیس گھوما ہوا--- اسلام آباد یا لاہور کے بنگلے کے نفاست سے سجے ڈرائنگ روم میں اپنے پائپ کی راکھ ایش ٹرے میں صاف کرتا ہے اور بے پروائی سے کہتا ہے-

"سب چلتا ہے--- اس تحریک نے ہمیں ہمارا تشخص دیا ہے- مہاجروں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ انہیں کسی نے پلیٹ میں رکھ کر نہیں دیا--- یہ ان کی ماہ و سال کی' شب و روز کی محنت شاقہ کا حاصل ہے- میں اس مقام پر کسی دبڑ دھونس' کسی کوٹا سسٹم یا سفارش کے ذریعے نہیں آیا ہوں-"

مگر--- خدا نہ کرے--- کہیں وہ کراچی کی اس چھوٹی سی بستی میں پہنچ جاتا تو قائد کے روبرو بلکہ ان کے کمرے سے ملحق راہداری میں اسے مرغا بنانا ناممکن نہ تھا---

انا کو توڑو!

اب عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے کی کوشش کر رہی ہے- پھر وہ منہ چلا چلا کر کہتی ہے-

"دانشور--- دانشور--- ادیب اور شاعر--- اب یاد آئے ہیں مہاجر' ادیب اور دانشور؟ پہلے کبھی ان کا خیال آیا؟ پہلے کبھی سوچا؟ حسن ناصر بھی مہاجر تھا جس نے لاہور کے قلعے میں اذیتیں جھیلتے ہوئے جان دی- کبھی اس کا نام لیا؟ ابراہیم جلیس بھی مہاجر تھا جس نے ضیاء مارشل لاء میں فوجیوں کا قہر سہا--- اور جو اپنے معتوب اخبار کے دفتر میں فوجی ہیڈ کوارٹر میں' جھڑکیاں اور دھمکیاں سننے کے بعد دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا---"

"تحریکیں نیک ارادوں سے نہیں چلتیں" بوڑھا بڑبڑاتا ہے- "جب تک تضادات کو

ہوا نہ دی جائے--- عوام کے کسی خاص احساس محرومی پر فوکس---"

"احساس محرومی---" بڑھیا بڑبڑاتی ہے۔ "کبھی سندھ کے دیہات میں جا کر دیکھیں جہاں بے شمار لوگوں کو پانی تک نصیب---"

بوڑھا ہنستا ہے۔ "اب--- ایسا ہوتا ہے کہ---" وہ اب اپنا دوسرا گلاس ختم کر رہا ہے۔ "سماجی اکائیاں اپنی ہی محرومیوں کے نعرے لے کر چلتی ہیں--- دوسروں کی نہیں۔ اب سندھی قوم پرستوں کو لیجئے۔ جن حقوق کو یہ اپنے قومی بلکہ انسانی حقوق کہتے ہیں' ان کے تصور کے کسی دور دراز ترین گوشے میں بھی' کیا یہ حقوق سندھ میں ہزاروں برس سے رہنے والی بھیل اور اوڈھ قوموں کے بھی ہیں؟ سندھ کے دیہات کی محرومیوں کا اپنے تمام زمانہ طالب علمی میں رونا رونے والے سندھی' اچھے گریڈ کی نوکریاں حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر یا انجینئر بن جانے کے بعد' ان دیہات میں پھٹکتے بھی نہیں--- وہ تو کراچی یا اسلام آباد میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ انسانی کمزوریاں ہیں اور اجتماع کی کمزوریاں بھی ہیں۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر عورت نے پوچھا۔

"اتنا اسلحہ ان کے پاس کہاں سے آیا؟"

"اسلحہ کراچی میں عام فروخت ہوا ہے--- افغان جہاد کا منطقی نتیجہ!"

اب عورت کی آنکھوں والے پانی کے غدود پھر سے متحرک ہو چکے ہیں۔

"مگر یہ بہیمیت--- یہ درندگی--- مخالفین کے بدنوں میں ڈرل سے سوراخ کرنا---" وہ اٹک اٹک کر بول رہی ہے--- الو کی پٹھی! خود بھی اردو اسپیکنگ ہے نا' اسی لیے--- اس کے منہ سے یہ الفاظ اسی لیے بڑی مشکل سے نکل رہے ہیں۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہے کہ یہ سب سچ نہیں ہے مگر دل کی انتہائی تاریک گہرائیوں میں جانتی ہے کہ یہ سچ ہے۔

"ایسا تو کوئی نہیں کرتا تھا!" وہ روتے ہوئے کہتی ہے۔ "آخر دوسری بھی سیاسی جماعتیں ہیں۔ یہ درندگی--- ان مہاجر لڑکوں کو کس نے سکھائی؟

"ایسٹ پاکستان میں!" وہ اچانک چونکی۔ "ایسٹ پاکستان میں سب سے پہلے ایسا ہوا تھا۔ پہلے بنگالیوں نے اردو اسپیکنگ لوگوں کے ساتھ یہ کیا تھا--- آنکھیں نکال لینا--- بدن کا سارا خون نچوڑ لینا---"

بوڑھا ہنسنے لگا۔ کھانس کر بولا۔ "ارے درندگی سیکھنے کے لیے کسی استاد کی ضرورت نہیں پڑتی!"

"آپ اپنی لکھی ہوئی کتاب دوبارہ خود پڑھیے' کبھی کبھی" دفتر میں اس کے ایک دوست نے اس سے کہا تھا۔

کبھی اس نے فسطائیت کی سماجی بنیادوں پر ایک جرمن نژاد نفسیات داں کی کتاب سے ماخوذ ایک مختصر جائزہ لکھا تھا۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی اخلاقیات میں جس طرح لطف لینے کو گناہ سمجھا جاتا ہے' حصول مسرت کے خلاف جو جذبہ ہے وہ اسے ایک ایسی روڑھی' روکھی پھیکی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے جو اس میں سادیت پیدا کرتا ہے۔ سادیت کا دوسرا رخ خود اذیتی ہے۔ یہ دونوں مل کر اس طبقے کو فسطائیت کے لیے زرخیز میدان کی طرح بنا دیتے ہیں۔ یہ طبقہ ایک حاکم کے حکم پر سختی سے کاربند رہنے میں خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس کتاب کا ماحصل یہی کچھ تھا۔ وہ اس نے خود لکھی تھی--- مگر--- مگر اس تھیسس کو کسی غیر مرئی ہیولے کے بارے میں لکھنا ایک بات تھی اور--- اور اسے اپنے پڑوسیوں پر' ان دبلے پتلے انسانوں پر منطبق کرنا بالکل دوسری بات تھی جو اب خود مار کھا رہے تھے--- جن کی مسخ کی ہوئی لاشیں شہر کے گلی کوچوں سے برآمد ہو رہی تھیں--- جن کے لیے اس کا اپنا دل خون ہو رہا تھا--- جو طبقہ نہیں' جیتے جاگتے لڑکے تھے۔ کسی کے بیٹے' کسی بہن کے بھائی' ہنستے ہوئے' گاتے ہوئے' سڑک پر سچ مچ چلتے ہوئے---

اسے وہ دن یاد آیا جب اچانک شہر میں سفید رنگ کے بے شمار بینر لگا دیئے گئے تھے جن پر سرخ الفاظ میں تحریر تھا۔ "جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے۔" تمام گلی کوچے اس خون جما دینے والے نعرے سے اس طرح ڈھک گئے تھے کہ کسی بلند عمارت سے دیکھنے پر شہر کسی زخمی کے مانند نظر آ رہا تھا جس کے تمام جسم پر خون سے رستی ہوئی پٹیاں باندھ دی گئی ہوں۔

اس دن شہر میں بے پناہ دہشت تھی۔ ایم کیو ایم کے باغی گروپ کے لوگ' جو بعد میں ایم کیو ایم حقیقی کے نام سے معروف ہوئے' چند دن پہلے ہی شہر سے غائب ہوئے تھے۔ لوگ خاموش تھے۔ شہر اس نعرے کے ہول سے سنسنا رہا تھا۔ موت کا--- موت کا--- موت کا حقدار ہے!

اس دن موت اپنے سیاہ پر کھولے ہوئے کراچی پر اپنی تاریک پرچھائیں ڈال رہی تھی۔

یہ فاشزم ہے! شاید اس دن کچھ لوگوں کے دل چیخے ہوں۔ مگر ایم کیو ایم کی

فقید المثال افرادی حمایت کے سامنے لب کشائی کی جرات کسی کو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ جماعت جو کراچی کے غریب، نچلے متوسط طبقوں پر مشتمل تھی جو فلسفہ آرائیاں کرنے کی--- ان کے خیال میں "عیاشی" کی--- متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ طبقے اور یہ محنت کش نیم خواندہ لڑکے ڈسپلن اور فاشزم میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔

کاریگروں نے بابوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آنچ کاغذی استاد کھا گئی

مزدور طبقے کے ایک شاعر نے جب جوش اور جذبے میں یہ شعر لکھا تھا تو کیا وہ سوچ بھی سکتا تھا کہ اس کا عملی مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے، یہ بھی؟ جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے؟

اب بہت دیر ہو چکی تھی اور شام ہو جانی چاہیئے تھی۔ اس سفید، جہنم کی طرح دہکتے ہوئے سورج کو اب تک ٹھنڈا پڑ جانا چاہیئے تھا مگر کسی طلسم کے باعث ایسا نہیں ہو رہا تھا اور سورج مستقل نصف النہار پر تھا۔

کراچی میں اس روز کا اسکور سولہ تھا۔ تین لاشوں کے ٹکڑے بوریوں میں بند ملے، دو پولیس کے سپاہی گولی کھا کر ہلاک ہوئے، ایک نالے میں ایسا آدمی ملا جس کی ٹانگیں کاٹ دی گئی تھیں، باقی کے پولیس مقابلے میں مارے گئے۔

یہ کون کر رہا ہے؟ اس نے ہواؤں سے، خلاؤں سے، ستاروں سے پوچھا۔

ان سب نے مستعدی سے جواب دیا۔ اس تنظیم کے دو متحارب گروہ کر رہے ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ کو سرکاری پشت پناہی حاصل ہے؟

جی ہاں، کیونکہ یہی ان کی مسلح قوت کو گلی کوچوں میں چیلنج کر سکتا ہے۔

پھر اس قوت کا کیا کیا جائے گا؟

یہ تو ابھی پتہ نہیں--- کچھ نہ کچھ حل سوچ لیں گے!

اگر اس تنظیم سے سیاسی صلح ہو جائے تو پھر اس کی مسلح قوت حرکت میں نہیں آئے گی--- یہ بھی تو ہو سکتا ہے؟

بہرحال--- جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں--- یہ مناسب نہیں سمجھا گیا۔

اس تمام عمل سے ایک خاص کمیونٹی کے لیے پورے ملک میں جو نفرت پھیل رہی ہے اور خود اس کے اندر جو احساس بے گانگی پیدا ہو رہا ہے، اس کے بارے میں کیا کہنا ہے؟

برے کام کا برا نتیجہ!

پورے پورے محلوں کے افراد کو قمیصیں اتروا کر، آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر تھانوں میں لے جانے سے کیا حاصل ہے؟

تو وہ بتاتے کیوں نہیں کہ اس تنظیم کے مسلح لڑکے کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ خوف کے مارے چپ رہتے ہیں۔

صرف خوف کے مارے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کی عوامی حمایت اب بھی موجود ہو؟

ہو سکتا ہے--- مگر اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

بلدیاتی انتخابات کروا کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

اور اگر یہ جیت گئے تب؟ نا بابا نا! ایسی غلطی دوبارہ نہیں کی جا سکتی۔

اگر--- بالفرض محال--- یہ عوام میں اب بھی مقبول ہیں، تب لاکھوں شہریوں کی رضا کو جبراً کچلنا--- جمہوری اقدام تو نہیں ہو سکتا۔

اگر لاکھوں شہری ایک فسطائی جماعت کے ہم نوا بن جائیں تو ہم کیا کریں!

اسے سیاسی عمل کا راستہ فراہم کر کے، اس کے فسطائیت کے رجحان کو ختم کر کے، بحیثیت ایک سیاسی تنظیم کے رہنے دیا جائے--- کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟

خاموشی
خاموشی
خاموشی

یہ ہندوستانی ایجنٹ بن چکے ہیں۔

باری باری--- جیسا کہ آپ جانتے ہیں--- سب ہندوستانی ایجنٹ بنے۔ اقتدار اور وسائل میں شرکت ملنے پر واپس پاکستانی ایجنٹ--- معاف کیجئے گا پاکستانی بن گئے۔ تو کیا ان کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا؟

خاموشی
خاموشی
خاموشی

بہیمیت صرف نچلے متوسط طبقے کی میراث نہیں۔ شاید کسی کو یاد ہو--- چند برس پہلے، سترہ سندھی نوجوان پکڑے گئے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ یہ الذوالفقار کی تنظیم سے تعلق رکھتے

ہیں' ان کے ایما پر مسلح تربیت لینے جا رہے تھے – بعد میں ان میں چند کی لاشوں کے ٹکڑے بوریوں میں بند ملے تھے – لاشیں کئی دن پرانی تھیں اور بو چھوڑنے لگی تھیں – وہ کام تو مہاجروں کی تنظیم نے نہیں کیا تھا؟ سوال یہ ہے کہ تفتیش کے دوران لاشوں کے ٹکڑے کیوں کر ہو گئے؟

خاموشی

خاموشی

خاموشی

دہشت کے بدلے دہشت --- زہر کو زہر کاٹتا ہے – اسلحے کا مقابلہ اسلحے ہی سے کیا جا سکتا ہے!

اس پر عورت نے زور سے قے کی اور منہ پونچھتے ہوئے بوڑھے سے پوچھنے لگی –

"اور آپ کا کارنامہ کیا ہے؟"

"مہاجروں کو تشخص ملا – شیعہ سنی فسادات ختم ہو گئے اور میں چاہتا تھا کہ سندھی مہاجر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں ---"

"ہوں --- تو مہاجر تشخص کو اور اتحاد کو ختم کرنے کے لیے --- زہر کو زہر کاٹتا ہے والے نظریئے کے مطابق --- غالباً سنی شیعہ فسادت کرانے کی کوشش کی گئی تھی کراچی میں --- مگر کامیاب تو نہیں ہوئی؟"

"اب تو بوتل سے جن باہر آ گیا ہے ---"

"رہی یہ آخری بات کہ سندھی مہاجر اتحاد --- سو تو کسی دیوانے کی بڑ معلوم ہو رہی ہے – اب تو ان دونوں کی ایک دوسرے سے خاصی واضح دشمنی ہے –"

"خیر --- دس برس تک تو کنٹرول میں رکھا اس جذبے کو ---"

"ان دس برسوں کے لیے یہ گلدستہ قبول کیجئے!"

عورت نے بڑے میاں کو تازہ سرخ گلابوں کا ایک گلدستہ پیش کیا –

پھر دونوں تالاب میں واپس چھلانگ لگا کر غرق ہو گئے – تالاب کی سطح برابر ہو گئی – سورج اسی طرح نصف النہار پر چمک رہا تھا – ایک مگرمچھ نے کاہی تھوتھنی نکال کر گرم ہوا میں سانس بھری –

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

زنا بالجبر --- ہوا کہ نہیں؟

شہر میں سناٹا ہے اور ہڑتال --- کوئی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا' تمام دکانیں بند ہیں مگر دکانیں کھولی جائیں یا ایک محلے سے دوسرے محلے تک جانے کے لیے کسی سواری پر سفر کیا جائے تو پتھراؤ ہو سکتا ہے' گولیاں بھی چلائی جا سکتی ہیں –

ہو سکتا ہے یہ پتھراؤ اور فائرنگ وہ تنظیم کرے جس نے ہڑتال کی کال دی ہے – مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پتھراؤ اور فائرنگ اس تنظیم کی رقیب تنظیم یا حکومت کی خفیہ ایجنسیاں کروائیں تاکہ ان کا الزام ہڑتال کروانے والی تنظیم پر رکھا جا سکے –

ایسا ہو سکتا ہے --- کیونکہ کچھ بھی ہو سکتا ہے –

ممکن ہے کئی دنوں --- ہفتوں --- مہینوں سے ایسا ہو بھی رہا ہو – کیونکہ یہ شہر ایسا ہے جہاں عرصے سے ہو سکتا ہے کچھ بھی ہوتا رہا ہو –

ایک شخص ہڑتال یعنی شہریوں کی گھر میں نظربندی والے روزوی سی آر پر فلم دیکھ رہا ہے – ہندوستانی فلم ہے' ایک ڈاکو کی کہانی جس کا ایک بیٹا ڈاکو بنتا ہے اور دوسرا پولیس والا' جبکہ دوسرے بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ وہ ڈاکو کا بیٹا ہے اور ڈاکو بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ پولیس والا اس کا بھائی ہے – شخص مذکور کو یہ فلم ہزار بار دیکھی ہوئی لگتی ہے – پولیس کی نفری میں ایک حسین پولیس والی بھی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی بہانے بار بار پولیس یونیفارم اتار کر انگیا اور پنڈلیوں سے اونچا جگمگاتا لہنگا پہن کر ناچتی اور گانا گاتی ہے – پولیس والی ڈاکو کے اس بیٹے سے محبت کرتی ہے جو پولیس والا ہے – وہ یونیفارم میں بھی پرکشش لگتی ہے – خاکی پتلون اس کی رانوں اور جانگھوں پر پھنسی رہتی ہے – شخص مذکور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے –

فلم میں جب ڈاکو باپ پولیس والا بیٹا' پولیس والی اور ڈاکو بیٹا ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے ہوتے ہیں اور گاڑیوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا رہے ہوتے ہیں تو انہیں چنداں خبر نہیں ہوتی کہ ان کے آپس میں کیا رشتے ہیں۔ مگر فلم کے انجام تک پہنچتے پہنچتے تمام الجھاؤ دور ہو جاتا ہے۔ سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کس کا باپ' کس کا بیٹا اور کس کا بھائی ہے۔ باپ دونوں بیٹوں کو گلے سے لگا کر مرجاتا ہے۔

ہڑتال دراصل زنا بالجبر کے ایک واقعے --- یا مبینہ واقعے --- پر احتجاج کے طور پر کی گئی ہے۔ لڑکی کا بھائی ایک معتوب تنظیم سے تعلق رکھتا ہے۔ اور روپوش ہے۔ چند دن پہلے اخباروں میں ایک پندرہ سولہ برس کی روتی ہوئی لڑکی کی تصویر شائع ہوئی تھی اور ساتھ ہی یہ خبر کہ روپوش تنظیمی کارکن کی بہن کے ساتھ اہل خانہ کی موجودگی میں کئی افراد نے زنا بالجبر کیا۔

دوسرے دن سے مخالف تنظیموں کی جانب سے زنا کے الزام کی تردید شائع کی جانے لگی۔ چند ڈاکٹروں نے سرکاری طور پر لڑکی کا معائنہ کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اندام نہانی یا پستانوں پر اجتماعی زنا بالجبر کے نشانات دکھائی نہیں دے رہے۔ پھر لڑکی کا معائنہ ایک غیر سرکاری ہسپتال میں کروایا گیا۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اندام نہانی کے نچلے دائیں یا بائیں مقامات پر سرخی اور سوجن ہے۔

اس سے تنظیم کے سربراہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زنا ہوا ہے' جبکہ مخالف تنظیموں اور سرکاری وزرا نے یہ نتیجہ نکالا کہ زنا نہیں ہوا ہے۔

شخص مذکور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا کہ جماع یا زنا جیسے کام میں اتنے زیادہ عضلات' ہڈیاں' اعصاب' گوشت کے ریشے وغیرہ کام کرتے ہیں --- ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ بہرحال وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ زنا ہوا یا نہیں۔ ایک بات جس کا ذکر (غیر سرکاری ہسپتال کی) رپورٹ میں تھا یہ تھی کہ اندام نہانی کا اندرونی پردہ پھٹ چکا ہے لیکن اسے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ زخم بھرنے لگا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ تخمینہ لگایا جائے کہ ایک صحت مند' پندرہ سولہ سالہ لڑکی کے بدن میں اس قسم کا زخم بھرنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے --- ایک دن؟ اس سے زیادہ؟ --- جبکہ گوشت اور خون کے ذرات اپنے فطری کام میں مگن ہوں ---

چند دن پہلے اخباروں میں شخص مذکور نے یہ خبر پڑھی تھی کہ زیر عتاب تنظیم کا ایک

گرفتار کارکن کسی پوچھ گچھ کے سلسلے میں ایک کئی منزلہ عمارت کے بالائی حصے پر لے جایا گیا تھا جہاں سے اس نے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔

یہ خبر پڑھ کر شخص مذکور کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک نوجوان نے اصول پسندی کے باعث پولیس کا مخبر بننے پر خودکشی کو ترجیح دی۔ مگر بعد میں آنے والی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس نوجوان کو بالائی منزل سے نیچے پھینکا گیا تھا۔ اس انکشاف سے معلوم ہوا کہ نوجوان نے اصول پسندی کے باعث خودکشی نہیں کی تھی۔ ہائیں' یہ کیا بات ہوئی؟ شخص مذکور نے سوچا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دماغ نے اس انکشاف کو جذب کیا کہ اس گرفتار نوجوان کو کئی منزلہ عمارت کے بالائی حصے پر لے جایا گیا اور وہاں سے نیچے پھینک دیا گیا۔ اب کی بار شخص مذکورہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور تصور ہی تصور میں ایک مضبوط جال لے کر اس کئی منزلہ عمارت کے نیچے جا کھڑا ہوا اور گرنے والے نوجوان کو اس میں جھیل لیا۔ نوجوان اس سے لپٹ گیا مگر اس نے کہا کہ شکریہ ادا کرنے میں وقت نہ گنواؤ اور فوراً گھر جاؤ۔ نوجوان آنسو پونچھتا ہوا ننگے پیر ہی گلیوں گلیوں دوڑ گیا۔ جب وہ ہانپتا ہوا گھر پہنچا تو اس کی ماں نے روتے روتے اسے گلے سے لگایا --- اس کے بعد شخص مذکور کا تصور کند ہو گیا۔ وہ مزید تصور نہ کر سکا کہ گھر والوں نے اسے پانی پلایا ہو گا یا دودھ پلایا ہو گا۔

تصور کے ختم ہو جانے پر اس نے حقیقت کا سامنا کرنے کی ٹھانی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ نوجوان بالائی منزل سے گرنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ جال میں زندہ سلامت نوجوان کی جگہ اس کے سامنے ایک ہڈیاں ٹوٹی' کھوپڑی پھوٹی' لاش پڑی تھی۔ اب تو وہ اور بھی رویا اور ماتم کرنے لگا اور سینے پر دو ہتڑ مار مار کر ہچکیوں میں کہنے لگا۔ ہائے نوجوان لڑکے! کیسے تجھے پالا تھا ماں نے سینے سے لگا کر' پل پل تیری بلائیں لے کر۔ دروازے پر منتظر رہتے تھے گھر والے' اگر تو دیر سے آتا تھا تیرے لیے کھانا ڈھانپ کر رکھتے تھے' منتیں کر کر کے تجھے کھلاتے تھے اگر تو کبھی کھانے سے انکار کرتا تھا۔ تیرا سر ذرا بھی دکھنے لگتا تو پیار سے سر میں تیل کھپاتی تھی تیری بہن یا تیری ماں --- یہی سر جو آج زمین پر تڑخا پڑا ہے --- کھوپڑی کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی' خون میں تر مغز زمین پر بکھرا ہوا اور ان پر مکھیاں بیٹھتی ہوئی۔

ہائیں' شخص مذکور نے سینہ کوبی بند کر کے گردن لمبی کر کے غور سے کھوپڑی کے اندر دیکھا۔ تو یہ ہوتا ہے کھوپڑی کے اندر؟ اس نے نہایت تحیر اور سنسنی کے عالم میں خود سے

کہا۔ مگر وہ طبی سائنس دان تو نہ تھا کہ مزید تحقیق کرتا کہ آدمی کی کھوپڑی کے اندر کیا ہوتا ہے۔ وہ تو محض چھٹی یا ہڑتال کے دن وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھنے والا ایک معمولی' عام شہری تھا۔ لہٰذا اس کا تجسس زیادہ دور تک نہ گیا۔ چند لمحے بعد اس نے دوبارہ مرنے والے کے اعضاء کی جون بدلی اور سینہ کوبی کرنے لگا۔

لیکن اسی اخبار میں یہ خبر بھی تھی کہ ایک سر کٹے آدمی کی لاش ملی ہے جس کا عضو تناسل بھی کٹا ہوا ہے۔ لاش کی جیب سے یہ پرچی ملی ہے۔ "ایک مہاجر بہن کی بے حرمتی کرنے والے کا انجام۔"

پہلے بھی چند لاشوں کی جیبوں سے اس مضموں کی پرچیاں برآمد ہوئی تھی۔ "مخبری کرنے والے کا انجام۔"

یہ خبریں پڑھ کر شخص مذکور مزید حیران اور پریشان ہوگیا۔ وہ کٹے ہوئے سر کو دھڑ سے اور عضو تناسل کو رانوں کے بیچ میں جوڑ کر پورا آدمی بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ غور کرنے لگا کہ خوف کے باعث یا تکلیف کے باعث' یہ عضو تناسل پورا تنا ہوا ہے یا کملایا ہوا اور ایک جانب ڈھلکا ہوا ہے جیسے فوطوں پر آرام کر رہا ہو۔ اس نے لاش کو پلٹا اور دیکھا کہ سر کٹے کی پشت پر کوئی زخم نہیں ہے۔ دونوں سرینوں کے درمیان جہاں کولھے کی ہڈیوں کا جوڑ ہوتا ہے وہیں سر کٹے کی ریڑھ کی ہڈی کا آخری نچلا سرا تھا۔ اس نے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا ریڑھ کی ہڈی پر پھیر کر استخوانی زنجیر کی آخری کڑی کو اچھی طرح محسوس کیا۔ کہتے ہیں (شخص مذکور کو خیال آیا) کہ یہاں آدمی کی تمام قوت پوشیدہ اور خفتہ ہوتی ہے۔ پرانے زمانوں میں ہندوستانی ماہروں کا ایسا ہی خیال تھا۔ کہتے تھے کہ تپسیا یا مراقبے کے ذریعے یہ قوت جگانے پر آدمی محیرالعقول طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یا تو وہ ولی بن جاتا ہے یا شیطان--- واللہ اعلم!

دوسری خبریں یہ تھیں کہ بوریوں میں بند کچھ لاشوں کے ٹکڑے ملے ہیں۔ دن بھر بوریوں میں بند رہنے کی وجہ سے لاشیں یا ان کے ٹکڑے گھمس کھا گئے تھے۔ گوشت بالکل مرجھا گیا تھا۔ شخص مذکور ٹکڑے جوڑ جوڑ کر آدمی بنانے لگا۔ کچھ ٹکڑے سانولے اور کچھ گندمی رنگ کے تھے۔ آخر اکتا کر اس نے گندمی رنگ کے بریدہ اعضاء سیاسی مائل دھڑ کے ساتھ جوڑنے شروع کر دیئے۔ پھر اس نے بازوؤں کی جگہ ٹانگیں اور ٹانگوں کی جگہ گردن یا کلائی لگا دی۔ پھر وہ اس کھیل سے اوب گیا اور لاشوں کے ٹکڑوں کو واپس بوری میں بھر

دیا۔

اب وہ پولیس کانسٹیبلوں کی لاشوں کی طرف آیا۔ وہ مونچھ دار پولیس والے اپنی وردیوں میں مرے پڑے تھے۔ دونوں کا سن تیس پینتیس سے کم تھا۔ اس نے ایک پولیس والے کی وردی اتارنی شروع کی۔ پہلے قمیص پتلون سے کھینچ کر باہر نکالی۔ پھر بٹن کھولے اور لاش کے سرہانے بیٹھ کر قمیص کو کھینچ کر سر سے اتار لیا۔ اندر سے ایک میلی سفید بنیان برآمد ہوئی۔ پسینے میں بھیگی اور خون سے داغدار بنیان اس نے ذرا کراہت سے کھینچ کر اتاری۔ پھر اس نے پتلون کی پیٹی کھولی۔ اب وہ لاش کی پائنتی کی طرف بیٹھا تھا۔ اس نے جوتوں کے فیتے کھولے' پھر جوتے اتارے۔ پولیس والے کے پیروں میں موزے بھی تھے۔ موزے اتار کر اس نے ایک طرف ڈال دیئے اور باری باری دونوں ٹانگوں سے پتلون کے پائنچے کھینچ کر اتار دیئے۔ اب لاش صرف ایک جانگیہ پہنے پڑی تھی۔ شخص مذکور نے ایک کونے میں جا کر منہ چھپا لیا اور خوب ہنسا--- اس نے طے کیا کہ وہ اس لاش کا جانگیا نہیں اتارے گا۔

اس نے جیب سے استرا نکال کر لاش کی مونچھیں مونڈ دیں۔ اب یہ لاش کسی بھی تیس پینتیس برس کے مرد کی لاش لگ رہی تھی۔ پھر وہ اندھیرے میں لاش کو اپنے کندھے پر ڈال کر تاریک کوٹھری سے نکلا اور ایک پیلی ٹیکسی میں پیچیدہ راستوں سے گزرتا ہوا اس کئی منزلہ عمارت تک جا پہنچا جہاں پختہ فرش پر ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی۔

شخص مذکور نے ننگی لاش زمین پر رکھی اور بالائی منزل سے گرنے والے کی لاش کندھوں پر اٹھالی۔ یہ کام اس نے اتنی پھرتی اور مشاقی سے کیا کہ لاش پر ماتم کرنے والوں کو لاش کے بدل جانے کا پتہ بھی نہ چل پایا۔ وہ اسی طرح سر پر خاک ڈالتے' سینے پر دو ہتڑ مارتے' روتے اور بین کرتے رہے۔

شخص مذکور ہڈیاں ٹوٹی لاش کاندھے پر ڈالے برق رفتاری سے اندھیری کوٹھری میں پہنچا۔ وہاں کئی دوسرے پولیس والے آ چکے تھے۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

شخص مذکور نے بلا تامل جواب دیا۔ "میں یہاں کا چوکیدار ہوں سر!"

"اچھا" ایک پولیس والا بولا۔ "تو پھر تم بتاؤ--- یہاں ہم نے دو کانسٹیبلوں کی لاشیں رکھی تھیں' اب صرف ایک ہے۔ دوسری لاش کہاں گئی۔"

"یہ رہی سر" شخص مذکور نے کاندھے پر رکھی لاش زمین پر آہستہ سے لٹا دی۔

"مگر--- اس کے کپڑے؟" انہوں نے اعتراض کیا۔

"آیئے ہم اسے وردی پہناتے ہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ وہ اس قدر مستعدی اور توجہ سے لاش کو کپڑے پہنانے میں منہمک ہو گیا تھا کہ پولیس والے چون و چرا نہ کر سکے اور خود بھی وردی پہنانے اور جوتوں کے فیتے باندھنے میں اس کی مدد کرنے لگے۔ ہڈیاں ٹوٹی لاش وردی پہننے کے بعد بالکل پولیس والے کی لاش لگنے لگی۔ دوسرے پولیس والے اسے بڑی تعظیم سے اٹھا کر لے گئے۔

شخص مذکور تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا--- پھر رانوں پر ہاتھ مار مار کر اس قدر ہنسا کہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ حالانکہ وہ ڈر رہا تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ہنسنے کی آواز بلند نہ ہو مگر یہ خیال کہ اس نے ماتم کرنے والوں میں گھپلا کر دیا ہے' اسے ہنسی سے دیوانہ کئے دے رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کئی منزلہ عمارت سے پھینکا جانے والا نوجوان تو مہاجر ہو گا--- اردو اسپیکنگ!--- اور یہ دوسری لاش--- نہ جانے کس کی تھی۔ کہیں پہچان نہ لی جائے۔ یہ خیال آنے پر وہ چونک گیا اور کچھ بے چین ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی وہ اپنے تردد کی حماقت پر ہنسا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ لاشیں بول نہیں سکتیں' اس لیے مرے ہوئے آدمی کے بارے میں سرمو اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ پنجابی تھا' سندھی تھا یا--- اردو اسپیکنگ۔

شخص مذکور اپنے کامیاب کھیل پر خوش ہو کر ہندوستانی فلم ری وائنڈ کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اصل زندگی بالکل ہندوستانی فلم جیسی ہی ہے' بلکہ اسی کی طرح کئی بار کی دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اتنے میں بجلی چلی گئی۔ وی سی آر کھٹاک سے رک گیا اور پنکھا بھی بند ہو گیا۔ شخص مذکور اخبار سے پنکھا جھلنے لگا۔ اخبار میں بس اسی طرح کی خبریں تھیں۔ اداریہ بھی اسی موضوع پر تھا کہ "کراچی خون میں نہا رہا ہے۔" اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ بھاڑ میں جائے کراچی--- کیا دنیا میں اور کچھ بھی نہیں ہو رہا؟

وہ دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر اس نے پوری دلجمعی کے ساتھ آہستہ آہستہ یہ الفاظ اپنے منہ سے ادا کئے۔

"کھڑکی--- کی--- جالی--- پھٹ--- گئی--- ہے۔"

"سڑک--- پر--- ایک--- بلی--- جا--- رہی--- ہے۔"

"پردہ--- ہوا--- سے--- ہل--- رہا--- ہے۔"

"میری--- فاختہ--- نے--- دو--- دن--- سے--- باجرا--- نہیں--- کھایا۔"

لیکن وہ زیادہ دیر تک یہ جملے دہرا نہیں سکا۔ وہ واپس سونے کے کمرے میں آ گیا اور کتابوں کے طاق پر نظر دوڑانے لگا۔ اس نے اپنے لیے ہندوستانی تاریخ کی ایک کتاب چھانٹی' کیونکہ وہ کوئی ایسی کتاب پڑھنا چاہتا تھا جس کا کراچی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اسے یقین تھا کہ کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے' کم از کم تاریخ کا تو اس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

بستر پر نیم دراز' تکیے کا سہارا لیے' رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ کتاب پڑھنے لگا۔ کسی انگریز مورخ کی تحریر تھی۔ اس نے کتاب جہاں سے کھولی تھی' اتفاق سے وہ کتاب کا ساتواں باب "بنگال میں انگریز" تھا۔

"مغلوں کے دور میں"--- کتاب میں لکھا تھا--- "ہندوستانی کسان اس زمانے کے یوروپی کسانوں سے بعض اعتبار سے بہتر حالت میں تھے۔" اچھا؟! شخص مذکور نے آنکھیں مل کر تعجب سے یہ سطریں دوبارہ پڑھیں۔ آگے لکھا تھا۔ "ان کے پاس کھانے کے لیے خوراک اس زمانے کے یوروپی کسانوں سے زیادہ مقدار میں ہوا کرتی تھی۔"

"اٹھارھویں صدی کے آغاز میں بنگال کے ضدی نواب سراج الدولہ نے کمپنی بہادر کو کلکتے سے نکال دیا۔ کلاؤ مدراس سے بھاری فوج لے کر آوارد ہوا اور 1757ء میں اس نے کلکتہ دوبارہ فتح کر کے میر جعفر کو تخت پر بٹھا دیا۔"

"اور یہاں"--- کتاب میں درج تھا--- "ہم کلائیو کی شخصیت کا دوسرا روپ دیکھتے ہیں۔ گریلا جنگ کا قابل رہنما' باصلاحیت سفارتکار' موقع ملنے پر لٹیرا بھی ثابت ہوا--- کلائیو نے اور کمپنی بہادر کے اہلکاروں نے میدان صاف پا کر خوشحال بنگال کا خون نچوڑنا شروع کر دیا۔ وہ صرف خزانہ ہی نہیں خالی کر رہے تھے وہ دیہات کو بھی لوٹ رہے تھے۔ چند ہی برسوں میں بنگال برباد ہو چکا تھا اور کمپنی بہادر' اہلکاروں کی بے راہ روی کے باعث' دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی---"

"تو پھر آئے وارن ہیسٹنگز۔ اب دیکھیے کہ ہیسٹنگز میں بھی نہایت اعلیٰ صلاحیتیں تھیں مگر کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کے مزاج میں تلخی آ گئی۔ وہ نند کمار کے قانونی قتل میں برابر کے شریک رہے' بنارس کے راجہ کو بہت تنگ کیا اور اودھ کی بیگمات کو ہراساں کرتے رہے۔ ان شکایتوں پر ان کے حریفوں کی بن آئی اور انہیں برطرف کر دیا گیا---"

پسینہ پونچھتے پونچھتے شخص مذکور نے شدید غم و غصہ محسوس کیا۔ اس نے دل ہی دل میں کلائیو اور ہیسٹنگز کو گالیاں دیں--- "حرام زادے--- کتے کے بچے--- انہیں کیا حق پہنچتا تھا--- کیا حق---" لیکن وہ اس گرم کمرے میں رکھی سر کٹی لاش کا کیا کرے' یہ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

پسینہ بہہ بہہ کر اس کی گردن سے قمیص کے اندر ٹپک رہا تھا۔ اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا اور پھر وہ بے تحاشہ ہنسنے لگا۔ سر کٹے کا عضو تناسل بھی کٹا ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ زانوں پر ہاتھ مارا۔ واہ استاد! یہ تو تم نے لاجواب کام کر دیا--- سر کٹی اور عضو تناسل کٹی لاش! یہ تو سچ مچ کا گھپلا تھا۔ آناً فاناً شخص مذکور نے لاش کو کاندھے پر ڈالا اور سرحد کی جانب چل پڑا۔

سرحد پر تعینات افسران نے اس سے پوچھا۔ "آپ اس سر کٹی لاش کو کہاں لے جا رہے ہیں۔"

شخص مذکور منہ چھپا کر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ "سرحد پار--- لوگوں کو الو بنانے۔ بھئی دیکھیے وہاں ہندو مسلمان کی پہچان یہی (ہاتھ سے کٹی ہوئی جگہ پر اشارہ کر کے) تو ہوتی ہے۔ پاجامے کھول کھول کر دیکھتے ہیں بھئی پاجامے کھول کھول کر--- تو اب آپ دیکھیے گا۔ ہندو مسلمان سکھ' تینوں کو الو بناؤں گا۔ ذرا اس لاش کو دیکھیے--- اس کا وہ ہی نہیں ہے۔ تو اب یہ ہے کیا؟ بس بالوں بھرا ایک سانولا سابق ہندوستانی--- یعنی اب تو ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش ہے نا--- تو ہم--- ہم اسے نندر کمار کی لاش بھی ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ ذرا دیکھتے تو جایئے۔ خدا قسم وہ مزہ آئے گا کہ ہنستے ہنستے ہم پاگل نہ ہو جائیں تو میں مونچھ منڈا دوں گا۔" شخص مذکور نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا جو پسینے سے بھیگ کر اس کے ہونٹوں پر چپکی جا رہی تھیں۔

"نند کمار؟" افسران نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کون ہے؟"

شخص مذکور نہیں جانتا تھا نند کمار کون تھا اور وارن ہیسٹنگز اس کے قانونی قتل میں کیوں شریک کار رہا۔ انگریز مورخ نے یہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔

اس نے الجھ کر کہا۔ "ہو گا کوئی--- آپ کو اس سے کیا؟"

سرحد پر تعینات افسران نے متانت سے کہا۔

"آپ سرحد پار کے معاملات میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔

آپ کے نیک جذبات بہرحال' اپنے وطن' اپنی قومیت' اپنی قوم پرستی کے حق میں تھے۔ لیکن اس طرف قدم رکھتے ہی آپ کی قوم پرستی' حب الوطنی اور قومی وفاداری پر فی الفور آنچ آ جائے گی۔"

اب کی بار شخص مذکور ہنسا نہیں--- وہ رونے لگا۔ سر کٹے کے کٹے ہوئے' گم شدہ عضو کی جگہ پر ہاتھ پھیر کر اس نے کہا۔ "یہ کہاں گم ہو گیا؟"

ایک کھمبے کے سہارے نہ جانے کب سے ایستادہ' قوم' قومیت' قوم پرستی' قوام یا قفقہ نامی روئی کی وہ قد آدم گڑیا جس کے منہ پر دھاگے سے نمک پارے جیسی سیاہ آنکھیں اور سرخ شہوت بھرے ہونٹ کڑھے تھے' جس کی روئی ٹھنسی بے تحاشہ ابھری ہوئی لذت خیز چھاتیوں کی سرخ بھٹیوں سے وی سی آروں' فرجوں اور ایئر کنڈیشنروں اور بچارو گاڑیوں کے دودھیا دھارے بہہ رہے تھے اور جو کثرت استعمال سے سرینوں کے پاس بے طرح پھٹ گئی تھی اور ان چاکوں سے روئی نکل نکل کر زمین پر گر رہی تھی' اچانک شخص مذکور پر آ گری۔

شخص مذکور اچانک قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس نے گڑیا کے سیاہ دھاگوں سے بنے الجھے بالوں کا گچھا جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"تو بتا سالی--- زنا بالجبر ہوا تھا کہ نہیں؟"

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (1)

پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہم ایک مسلح آمرانہ نظام کے غیر مسلح، عوامی گروہوں کے نمائندہ جمہوری نظام میں تبدیل کیے جانے کی کوشش کے انتہائی تکلیف دہ پر پیچ اور ناہموار زمانے کا نظارہ کر رہے ہیں؟ جبکہ پرانے نظام کے ستون لڑکھڑا کر ہمارے سروں پر گر رہے ہیں اور ہم گردن تک اور بڑکھا بڑ ملبے میں دفن ہو رہے ہیں۔ جبکہ ماضی حال اور مستقبل کے طاقتور ہاتھ معاشرے کو بے دردی سے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، جھنجھوڑ رہے ہیں جیسے گرجتی ہوئی طوفانی ہوائیں کسی تناور درخت کو جھنجھوڑ کر جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔

اس جان لیوا کشمکش میں جیت کس کی ہوگی؟ کیا ان جمہوری رجحانات کی جو بے حد کمزور ہیں، جو بیک وقت کسی نوزائیدہ بچے کی مانند بے طاقت اور کسی گرم و سرد زمانہ چشیدہ بڈھے کی طرح کرپٹ ہیں؟ یا ماضی کا سربرآوردہ، فربہ عضلات والا آہنی ہاتھ ان پر غالب آجائے گا؟

خیالوں کی اڑان میں ایک خاموش، سرد، طویل رات میں بستر میں کروٹیں بدلتی عورت نے سوچا تھا اور اس بحث سے دور، بالکل لاتعلق ایک آدمی--- پوری عمر کا آدمی--- رو رہا تھا۔

"ارے!" وہ حیران رہ گئی تھی۔ "رو کیوں رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں---" اس نے سرخ آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"اتنی--- اتنی بے روزگاری ہے---"

"کیا؟" اس نے بھونچکا ہو کر کہا تھا۔

اور پھر وہ ایک نیند میں ڈوب گئی تھی اور اس نے ایک بہت بڑے گراں ڈیل، تیل کی سیاہ کیچڑ میں لتھڑے، بھاری پہیے کو حرکت کرتے دیکھا تھا جو آہستہ آہستہ نہ جانے کس طرف جا رہا تھا اور جس کے نیچے ان گنت آدمیوں کی ہڈیاں پس رہی تھیں، کھوپڑیاں پھٹ کر مغز ابل رہے تھے، خون کے فوارے کالی کیچڑ میں ملتے جا رہے تھے۔ بازو، ٹانگیں، دھڑ، کٹ کٹ کر پہیے کے راستے کے ادھر ادھر پھسل رہے تھے۔

یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے خواب میں کہا تھا اور سوچا تھا کہ اس کے وطن میں ماضی، حال اور مستقبل کے ہاتھ کیا تین مختلف ہاتھ ہیں؟ یا یہ ایک ہی ہاتھ ہے جو وقت کے تین مقامات سے کسی طلسم کے طور پر نمودار ہو رہا ہے۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

"کسے بے کسور نوں نئیں پھڑ رئے" چوہدری اکرام نے دردمندی سے کہا۔ "اناں دا اپنا دھندا وی ایہو ای سی، جسم دی نازک حصاں تے ڈرل کرنا، اکھاں تے دند کڈھ لینا۔ ایہو سب کم ایہہ کر دے سن۔ اناں دی اپنی دوائی دا اکو ڈوز دے رئے آں، ہور کچھ نئیں کر رئے بادشاہو!"

"پر--- چوہدری صاحب--- ایہہ تے باقاعدہ سیاسی تنظیم اے--- ایس دا ماس بیس--- اناں دے نال مذاکرات---"

"اوہی کراں گے، خاطر جمع رکھو" انہوں نے دلجمعی سے تسلی دی۔

"مذاکرات؟"

"آہو، کیوں نئیں کراں گے؟ اوہنی کجھ تسلی تے رکھو!"

"تے ایہہ لوکی---"

"آہو آہو، اپنے ای تے منڈے نیں ایہہ سب۔ بس برین واش کر دتا گیا اے۔ تے نالے ہن انڈیا دے پھندے وچ آ گئے نیں۔ ضرور کراں گے مذاکرات اناں دے نال۔ پر ساڈی پوزیشن سٹرانگ ہونی چاہیدی اے ناں۔ اناں دا ملی ٹینٹ ونگ ختم ہو جاوے تے فیر مذاکرات وی ہون گے۔"

"سمجھا!" سوال کرنے والوں نے امید بھری نظریں چوہدری صاحب کے چہرے پر لگا

دیں- پھر کچھ خیال آنے پر وہ روتی دھوتی آواز میں چوں چرا کرنے لگے-

"پر ویکھو ناں--- ایہہ گلاں تے تسیں شاید ہمیشہ توں کر دے آئے او- اوہ جیہڑے ایسٹ پاکستان وچ ہزاراں' لکھاں قتل کیتے گئے سن--- اودی تے ساڈے اپنے ای بندے سن- بس برین واش ہو گئے سن' تے فیر--- فیر انڈیا دے پھندے وچ آ گئے سن--- فیر بلوچستان وچ پنڈاں اتے بمباری کیتی گئی سی- ایس توں پہلے کئی بلوچ لیڈراں نوں پھاہی دے وتی گئی سی--- تے فیر ایہہ سب--- ایہہ سب---" وہ غرغرائے-

"ایسٹ پاکستان وچ تے ہندوواں نے وڈی سازش کیتی سی- تے بلوچ سرداراں دا وی دماغ خراب کر دتا گیا سی- علیحدگی پسند ہو گئے سن سب- تے باہروں امداد وی آؤندی سی-"

یہ سن کر وہ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے- "باہروں امداد؟ آخر دنیا ساڈی دشمن کیوں ہو گئی اے؟ روس ساڈا دشمن--- انڈیا تے ہے ای دشمن- چین تے امریکہ دوست نیں' تے او تاریخ دے زیادہ تر حصے اچ اک دوجے دے دشمن- عرب ساڈا ساتھ نئیں ویندے- وقت پوے تے امریکہ مدد نئیں کردا- تے اپنے وطن آلے واری واری پاگل پن دا شکار ہو جاندے نیں- ساڈے دشمن اناں دی خفیہ امداد کر دے نیں- آخر کیوں؟ اساں دنیا دا کیہہ بگاڑیا اے؟"

یہ سن کر چوہدری صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے- انہوں نے آہ بھر کر کہا- "سچ کہندے او یارو- اوکھنا سوہنا تے بروقت کہیا سی غالب نے- یارب زمانہ مینوں مٹاؤندا اے کیس لئی- ایس لوح جہاں دی میں تکا بوٹی کیوں نہ کر دیاں---"

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (2)

لیاقت آباد کی ایک بلند و بالا' کئی منزلہ عمارت کی آڑ سے پیلا ماہتاب نکلا- (واہ! اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب! اسرار الحق مجاز یاد آ رہے ہیں-) یہی ماہتاب' کچے سونے کا سا' بادلوں کے ننھے سفید ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کھیلتا' معصوم نگاہوں سے سارے شہر کو دیکھ رہا ہے-

اس دن اس عمارت میں پانچ (یا چھ سات؟) مسلح افراد نے گھس کر اکٹھے دس قتل کئے تھے- یہ قتل کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے اس شعبے کے دفتر میں ہوئے تھے جو جائیدادوں کی فروخت اور مالکوں کی تبدیلی وغیرہ کا اندراج کرتا ہے اور جائیدادوں کے ٹیکس وصول کرتا ہے- شعبہ ہذا میں دس افراد تڑ تڑ تڑ آناً فاناً مقتول ہو گئے-

کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)-

جائیدادیں--- مکانات--- دکانیں--- محل دو محلے--- مٹی' گارا' اینٹیں' پتھر--- زمین--- زمین--- زمین کے بیٹے--- زمین کے بھائی--- زمین کے باپ' معشوق' گاہک--- دلال--- زمین کے چچا' بھتیجے--- زمین کے ماموں--- زمین کے مالک--- زمینوں کے مالک--- صاحب جائیداد---

رات کو قومی ٹیلی ویژن پر کہا گیا کہ یہ تو معتوب لسانی تنظیم کی کارستانی ہے بلکہ شام ہی کے اخباروں میں چشم دید گواہوں کی زبانی قاتلوں میں سے چند کے نام بھی شائع ہو گئے جنہیں اخباروں میں شائع شدہ (داخل شدہ؟) خبر کے مطابق علاقے کے دکانداروں نے پہچان لیا تھا-

بہتے ہوئے آنسو تھم نہ سکے' کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)-

یہ قتل کس نے کیے؟

کیا قومی ٹیلی ویژن کی خبر درست ہے؟ کیا علاقے میں تنظیم ہذا کے لڑکوں نے بھتہ وصول نہ ہونے کے باعث یہ قتل کیے؟

ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ حالانکہ موچڑوں میں آنے کے بعد سے تنظیم ہذا کے لڑکے زیادہ تر دفاعی لڑائی لڑے ہیں مگر اس طویل عرصے میں غیر حل شدہ مسئلے کی معروضی صورتحال ایک کایا پلٹ سے بھی گزر چکی ہے۔ شہر کے علاقوں کے خالص مقامی گروہی' مفادات اور قتل در قتل در قتل کے باعث ذاتی انتقامی جذبات بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ قتل بھتہ نہ دینے کی سزا ہوں۔

عین ممکن اور بھی بہت کچھ ہے۔ جیسا کہ سڑک پر ایک سنکی ادھڑوٹ نے اول فول بکتے ہوئے کہا کہ "اماں ہوش کی دوا کرو! اگر وہ قاتل ایسے ہی زور آور ہیں تو دہشت نہیں ہوگی ان کی؟ اسی علاقے کے دکانداروں نے موقعے پر نام بھی بتلا دیئے؟ اور وہ--- کیا کہتے ہیں کہ--- اخباروں میں بھی آ گئے؟ شام کی شام؟ آئیں؟ میاں یہ گولیاں کسی اور کو دینا--- ہم بھی گندم کھاتے ہیں---"

تو پھر یہ قتل کس نے کیے ہو سکتے ہیں؟

اس دن کراچی میں کل اٹھارہ قتل ہوئے تھے۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

آسمان کتنا حسین ہے اور چاند کس قدر خوبصورت' لہٰذا فٹ پاتھ پر ایک پاگل' یا نیم پاگل' یا پاگل ہوتے ہوئے آدمی نے چاند کو بڑی دیر تک بہت غور سے دیکھا۔ نظر اٹھا کر ہر طرف دیکھیں تو کراچی آپ کو ایک پاگل' جنونی عورت سا نظر آئے گا جس کے بال منہ پر بکھرے ہوئے ہیں اور جس نے منہ پر خون مل لیا ہے اور جو چاند کی طرف منہ اٹھائے کسی مادہ بھیڑیئے کی طرح چنگھاڑ رہی ہے مگر اس پاگل' یا نیم پاگل' یا پاگل ہوتے ہوئے بوڑھے نے نظر اٹھا کر چار طرف نہ دیکھا بلکہ اپنی نظریں مضبوطی سے چاند پر جمائے رکھیں۔ سنہرا ماہتاب آسمان کی گہری نیلی' دوات میں بھری روشنائی کے رنگ کی وسعتوں میں تیر رہا تھا۔ اتنے خطرناک حالات میں بھی' چاند کے بلند ہوتے سے' جب رات بھیگ چلی' بوڑھا فٹ پاتھ پر کیوں؟ دراصل اس کے پاس جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یعنی یہ رہتے ہی یہاں ہیں۔ آپ انہیں نہیں جانتے' مگر میں جانتی ہوں ان کا نام رئیس میاں ہے۔ طارق روڈ کے بالکل عقب

میں جو پنساری بازار ہے جہاں سوئی سے لے کر بکرے تک فروخت ہوتے ہیں وہیں یہ ایک ریڑھی پر پلاسٹک کے برتن اور کھلونے بیچتے ہیں۔ صبح کے وقت یہیں سجاد پہلوان کی دکان پر ناشتہ کر لیتے ہیں۔ ایک جمعے کی پر فراغت صبح' سجاد پہلوان کی دکان سے بچوں کے لیے حلوہ پوری بندھواتے ہوئے میری ان سے بات چیت ہوئی تھی۔

پتا چلا کہ رئیس میاں سابق مشرقی پاکستان سے آئے ہیں (جہاں وہ گورکھ پور' مشرقی یوپی سے گئے تھے۔) پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے تمام رشتے دار' بیوی' بیٹے' بہو' پوتے پوتیاں' وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (کیوں؟ کیسے؟ یہ سب پوچھنے کا تو موقع نہ تھا۔) سو وہ سر پر میلی دوپلی ٹوپی منڈھے اور کھلے پائنچوں کا پجامہ کرتا پہنے ایک اکیلی جان ہی کراچی وارد ہوئے اور اب اپنی ریڑھی ہی پر رہتے ہیں۔

لہٰذا اس رات بھی سنسان گلی میں' جب تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں اور کتے بلیاں بھی مٹھائی کے دونے چاٹ کر ادھر ادھر سو چکے تھے اور بازار میں تبدیل ہو جانے والے اس سابقہ رہائشی علاقے کی' تجاوزات کی بھرمار سے نہایت تنگ اور پر پیچ گلیوں میں باقی بچے بالائی منزل کے مکانوں کی بتیاں نہ جانے کب کی گل ہو چکی تھیں' بوڑھا اپنی ریڑھی پر پیر پسار کر لیٹ گیا اور میلے بازار پر کندن کے تھال سے دمکتے برنجی ماہتاب کو دیکھتا رہا' یہاں تک کہ سنہری چاندنی اس کی بوڑھی آنکھوں میں تحلیل ہو گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

تب اسے علم ہوا کہ دراصل چاندنی اس کی آنکھوں میں نہیں گھلی بلکہ وہ خود چاندنی میں تحلیل ہو گیا ہے اور ایک ایسے مقام پر ہے جہاں ہر طرف ٹھنڈی' دلکش سنہری روشنی پھیلی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے لق و دق میدان میں کھڑا ہے۔ دور دور تک سنہری زمین پھیلی ہے۔

"کیا یہ کراچی ہے؟" رئیس میاں نے مدھم سانسیں لیتے ہوئے پوچھا۔

فضا میں پروں کی ہلکی پھڑپھڑاہٹ نے ان کو جواب دیا۔ "ہاں یہ کراچی ہے--- آج کا کراچی جو کل کا کراچی بنے گا۔"

بوڑھے نے آنکھوں پر زور ڈال کر پہچاننے کی کوشش کی' لیکن طویل و عریض میدان دوسرے میدانوں میں پگھلنے لگے۔ رئیس میاں کو محسوس ہوا کہ وہ کسی آواز سے تیز رفتار برقی سواری میں فاصلوں پر سے گزر رہے ہیں اور کہیں کہیں پہچان پا رہے ہیں کہ وہ ضلع ملیر سے لانڈھی' کورنگی' سرجانی ٹاؤن جا پہنچے ہیں یا نیو کراچی' منگھوپیر' سبزمنڈی سے گزر رہے ہیں جہاں چاندنی کے میدان در میدان خالی پڑے ہیں۔ آخر ایک سنہرے میدان میں ان کا

راکب رک گیا۔ سفید براق سے اسپ تازی کو رئیس میاں نے ایک آہنی میخ سے باندھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میدان کے ہر دو کناروں پر چند جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔

رئیس میاں نے پاس جا کر دیکھا۔ یہاں طبقہ اناث میں سے کوئی نہ تھا۔ صرف مسلح مرد تھے۔

"آپ کون ہیں؟" رئیس میاں نے لجاجت سے استفسار کیا۔ ان میں سے ایک نے سرخ آنکھوں سے انہیں گھورا اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم سے مطلب؟" پھر اس نے دھمکایا: "اپنا راستہ لے بڈھے!"

تبھی پولیس کی ایک جیپ وہاں آ کر رکی۔ جیپ میں سوار پولیس افسر نے شتر مرغ کی طرح گردن لمبی کر کے جھانکا اور شفقت سے جھونپڑی کے مکینوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیوں بھئی، ٹھیک ٹھاک تو ہو نا؟"

"جی صاب، بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کا کرم ہے جناب!" جواب ملا۔

"ٹھیک ہے--- تو پھر ہم چلتے ہیں۔ کوئی پریشان کرنے کی کوشش کرے تو ہمیں بتانا۔" اس کے بعد جیپ دھول اڑاتی اسٹارٹ ہوئی اور فراٹے بھرتی شہر کے بارونق علاقوں میں جا پہنچی۔ پھر وہ کئی جیپوں میں بدل گئی اور کئی پر تمکین عمارتوں کے سامنے رکی جہاں باوقار تعمیراتی اور دیگر کاروباری اداروں کے بورڈ لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی پر بھی "قبضہ گروپ" یا "لینڈ گریبرز ایسوسی ایٹس" کے نام کی تختی آویزاں نہیں تھی۔ مگر نام میں کیا رکھا ہے! تھانوں کو ماہانہ تو یہ ادارے کسی بھی مد میں دے سکتے ہیں۔

زمینوں پر قبضہ اس طرح بھی کیا جا رہا ہے۔ زمین کے ٹکڑے کی آؤٹ پوسٹ پر مسلح افراد کی جھونپڑیاں بنوا دی جاتی ہیں۔ قبضہ کرنے والے مالدار اور طاقتور افراد ہیں جو تنخواہ دار مسلح افراد تعینات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

"کون لوگ زمینوں پر قبضہ کر رہے ہیں؟" عورت نے الٹی سانسوں کے ساتھ آہستہ سے پوچھا۔

اس رات پیلے ماہتاب کو تکتے ہوئے وہ پھر ہوائی جہاز میں جا بیٹھی تھی جہاں اس نے ایک الوہی انٹرویو دیا تھا اور اس سوال کو ہذیان کی طرح دہرایا تھا کہ "کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟" لیکن اب یہ جہاز لندن جانے کے بجائے چاند کی طرف اڑا جا رہا تھا، اور چاند پر پہنچ چکا تھا۔

اسے سینے سے لگا کر جواب دینے والے بوڑھے نے، جو شاید خدا تھا اس سے کہا۔

"قبضہ کرنے کے لیے قوت بازو استعمال کرنے والے ہتھیار بند معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ یہ قتل کرنے اور قتل ہو جانے پر آمادہ ہیں۔ یہ کروڑوں روپے نہیں کماتے مگر رقم ان کو بھی خاصی ملتی ہے۔"

"کیا یہ کراچی کے لوگ ہیں؟" عورت نے پوچھا۔

"اب تو کراچی کے ہیں۔" بوڑھے نے آنکھیں مچمچاتے ہوئے کہا۔ "الگ الگ علاقوں میں الگ الگ قبضہ گروپ کام کر رہے ہیں--- ہاکس بے میں بلوچ ہیں، کورنگی اور مہاجر کیمپ میں (حیران نہ ہونا) بنگالی یہ کام کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں ان کا تسلط ہے وہاں ایم کیو ایم حقیقی یا الطاف بھائی کا نام لینے والے مصروف کار ہیں۔"

"ہوں---" عورت نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "سندھی نہیں ہیں قبضہ گروپ میں؟"

بوڑھا ہنسا--- (کیا وہ خدا تھا؟) "ہیں تو سہی---" اس نے کہا۔ "گلشن اقبال سے گلستان جوہر تک قبضہ گروپوں میں مخلوط لوگ ہیں۔ پنجابی ہیں، پٹھان ہیں اور ان میں سندھی بھی ہیں۔ وہ اس دھندے میں آہستہ آہستہ شامل ہو رہے ہیں۔" وہ پھر ہولے سے ہنسا۔

"تو کراچی میں یہ بھی ہو رہا ہے؟" عورت نے چاند پر استقامت سے نظریں جما کر کہا۔

"ہاں، یہ بھی۔" کسی نے جواب دیا۔ "کہیں زیادہ سفاکی کے ساتھ--- کیونکہ افراتفری اور سیاسی بدامنی کے زمانے میں ہر واردات سیاسی مخالف گروہ کے سر آسانی سے تھوپی جا سکتی ہے---

"پھر ڈرگ مافیا ہے--- جو عرصہ دراز سے ہتھیاروں کی فروخت کا کام بھی کر رہا ہے" بڑے میاں نے کہا۔

"ہوں---" عورت اب پھر ایک دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔

خواجہ اجمیر نگری اور قصبہ کالونی میں پٹھان مہاجر فسادات سے کراچی خون میں نہا گیا ہے۔ یہ ٹکراؤ لسانی صرف دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈرگ مافیا نے پورے شہر کو یرغمال بنا لیا ہو، کیونکہ بعض واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اس طرح کی تین رپورٹیں وہ اس انگریزی اخبار کو بھیج چکی ہے جس میں ان دنوں وہ کام کر رہی ہے۔ چوتھے دن ٹیلی فون پر دور، بہت دور سے اخبار کے ایڈیٹر کی آواز---

"بی بی' آپ یہ لفظ ڈرگ مافیا اب نہ لکھئے۔"

"کیوں کیوں ایڈیٹر صاحب؟" اس کی حیرت---

"بھئی یہ پشاور ہے--- ڈرگ مافیا سے لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ پٹھانوں کو قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔" خاموشی--- اس کے ہاتھ میں ٹیلی فون کا پلاسٹک کا ٹھنڈا ریسیور---

"سمجھ گئیں نا بی بی؟"

ہتھیار اور منشیات--- شہر کی شہ رگ میں رواں--- پیسا' بہت زیادہ پیسا--- کروڑ؟ دس کروڑ؟ یہ تو معمولی رقمیں ہیں۔ اس سے بہت زیادہ۔ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کچلنے کے لیے ہتھیار--- جو فروخت بھی ہوتے ہیں۔

کیسی رکاوٹ؟ جبکہ یہ روز محشر ہے اور عالم نفسا نفسی۔ اور جبکہ کل سورج کے طلوع ہونے کا کسی کو یقین نہیں اور آج جتنا پیسہ بنایا جا سکتا ہے وہ بنانا لازمی ہے۔ ہتھیاروں سے لدے ہوئے ٹرک علاقہ غیر سے سفر کی ابتدا کرتے اور چاندی کی چھتر چھایا میں پورے صوبہ سرحد' پورے صوبہ پنجاب' اور پورے صوبہ سندھ سے گزر کر کراچی میں ہتھیار مطلوبہ مقام تک پہنچاتے رہے ہیں۔ ان کو کہیں نہیں روکا گیا ہے۔ کہتے ہیں ساڑھے تین لاکھ میں ہتھیاروں سے لدا ٹرک بہ حفاظت گھر تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ توڑے دار بندوقیں نہیں' جدید ترین ماؤزر' ٹی ٹی' کلاشنکوف' بم' حتیٰ کہ دور مار میزائل بھی۔

آپ کو یقین نہیں آتا؟

کراچی میں لڑکوں نے میزائلوں سے نشانوں پر گولے برسائے ہیں۔ نشانہ لگانا ابھی انہیں نہیں آتا۔ پھینکتے کہیں تھے اور گولا کہیں جا گرتا تھا۔ زیادہ تر ان کا نشانہ رینجرز اور پولیس تھانے تھے' مگر گولے انہوں نے کہیں اور برسائے۔

"کیونکہ کراچی میں یہ بھی ہوتا رہا ہے---" بوڑھے نے کلام جاری رکھا۔ "مبینہ طور پر---"

"مبینہ یہ ہے کہ حقیقی کے لڑکے ایم کیو ایم کے لڑکوں کو قتل کر رہے ہیں۔ باقی سب بھی مبینہ ہے۔

"اس جھپیٹ میں وہ ذاتی دشمنوں یا جن سے کبھی تو تکار ہوئی ہو ان کو بھی قتل کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب ہتھیار اٹھارہ انیس برس کے لڑکے کے ہاتھ میں ہے تو وہ بادشاہ ہے اور اپنی مرضی سے کسی کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ وہ بھتہ وصول کر رہے ہیں اور بھتہ نہ دینے پر بھی

قتل کر رہے ہیں۔

"رینجرز اور پولیس (یہ بھی مبینہ ہے) ایم کیو ایم کے لڑکوں کو اذیت پہنچا کر قتل کر رہی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کسی کو مار دیں تو پوچھنے والا کون ہے؟ مبینہ طور پر یہ بھی بھتہ وصول کر رہے ہیں۔ گھروں میں گھس کر لوٹ مار کر رہے ہیں۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے لڑکوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے جو چودہ پندرہ برس کے تھے۔ یہ "نامعلوم مقامات" پر رکھے گئے ہیں۔ (مبینہ طور پر) رہا کرنے کی رقم پچیس ہزار روپے سے شروع ہوتی ہے۔

"ذرا صبر سے سنو--- یہ اکتا دینے والی طویل فہرست ہے---" بوڑھے نے کہا۔ "ایم کیو ایم الطاف گروپ کے لڑکے (مبینہ طور پر) حقیقی کے لڑکوں کو' پولیس اور رینجرز کو قتل کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی بھتہ وصول کر رہے ہیں اور بھتہ نہ دینے پر قتل کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ذاتی دشمنوں یا جن سے کوئی تو تکار ہوئی ہو انہیں بھی قتل کیا جا سکتا ہے۔

"اور یہ سب' یعنی پولیس' رینجرز' ایم کیو ایم حقیقی اور مجازی' اپنے ان ایجنٹوں اور کارکنوں کو بھی قتل کر رہے ہیں جو اب ان کے کام کے نہ رہے ہوں یا خطرناک بن چکے ہوں۔ ان کے نام پتے یہ ایک دوسرے کو فراہم بھی کر دیتے ہیں۔ قتل کرنے والے متحاربوں میں رفتہ رفتہ ایک طرح کا رازدارانہ تعاون پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ بھتے --- موٹی موٹی رقمیں--- اس گھومتے چکر کا مرکز ہیں۔ لہٰذا کچھ تمہارا کچھ ہمارا کی بنیاد پر' جو کہ گروہی مفادات کے تعاون کی بنیاد ہے اور جس کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں---"

اس پر ایک آدمی ہذیان میں چلایا۔ "کیا بک رہے ہو--- کیا بکواس کر رہے ہو---' ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ جھوٹ--- جھوٹ--- جھوٹ---" منہ سے جھاگ اگلتا وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

"کیا جھوٹ ہے؟" بوڑھے نے تھکاوٹ سے پوچھا۔ "یہ کہ اس شہر کے ساتھ' اس کے باسیوں کے ساتھ' اس قدر گھناؤنا' پرت در پرت' خون سے تر' سازش اور سفاکی سے غلیظ' مکروہ' جرم مہینوں' برسوں سے کیا جا رہا ہے؟"

"ہاں!"

"اور کوئی کچھ نہیں کہتا؟"

"ہاں!"

اس پر انگریزی کے ایک صحافی نے انگریزی میں نہایت تیز رفتاری سے کہا۔ "اور یہ سب کچھ اس لیے آسانی سے ہو رہا ہے کہ ایم کیو ایم' پی پی پی اور اسٹیبلشمنٹ میں سمجھوتا نہیں ہو رہا۔"

اس پر اس کے رخساروں پر تین چار چانٹے مارے گئے۔ "چپ سالا سمجھوتے کا پتر۔ ہمارا دھندا مندا کرنے آگیا۔ چلے آتے ہیں ٹھیکے دار۔ نہ کھیڈ ساں نہ کھیڈن دے ساں کے مصداق---"

بھئی ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے--- اس سے فیضیاب کیوں نہ ہوا جائے؟ اور یہ دریا ہمیشہ یا کم از کم چند برس اور کیوں نہ بہتا رہے؟

اسی دریا کے کنارے کھڑے ہیں سندھی بھی۔ نئے نئے جوان یہ بھی ہوئے ہیں۔ لٹھے کی کانچ قمیصیں پہنے' کاندھوں پر اجرک ڈالے' اپنی دھرتی کی مٹی اور مکھن کی مہک سے سوندھے' حیرت سے تمول کے اس بہتے دریا کو دیکھ رہے ہیں۔ اتنا پیسہ؟ اس میں ان کا حصہ کہاں ہے؟ ہتھیار تو وہ بھی چلا سکتے ہیں--- وہ کسی سے کم تو نہیں--- مرد کے بچے ہیں!

مگر کراچی میں وہ کیسے بھتہ وصول کر سکتے ہیں؟ بھتے کا بھی ایک "حلال" جواز تراشا جاتا ہے--- اسے "پروٹیکشن منی" کہا جاتا ہے۔ تو یہاں وہ کسی کو "پروٹیکٹ" کرنے کا سوانگ کیسے رچائیں؟ لیکن حیدر آباد میں' جہاں سندھی بھی 50 فیصد ہیں' انہوں نے بے ہتھیار سندھیوں کو "پروٹیکٹ" کرنا شروع کر دیا ہے اور وافر مقدار میں سندھیوں سے بھتہ وصول کر رہے ہیں۔

رات گئے ایک اکیلی سنسان گلی میں ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے بیمار زرد روشنی میں ایک چھریرا پولیس والا' جس کی پتلی کمر کسی ہوئی پیٹی میں بل کھا رہی ہے' کلے میں گلوری دبا کر نزاکت سے سگریٹ سلگاتا ہے اور مخمور نگاہیں آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے ماچس پھینک کر گنگناتا ہے۔

"ہم کو دعائیں دو--- ارے ہم کو--- دعائیں دو تمہیں--- قاتل بنا دیا--- آ آ آ--- ہم کو---"

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

خون مالیدہ چہرے والی عورت چاند کی طرف دیکھتے ہوئے مادہ بھیڑیئے کی مانند زور سے چنگھاڑی اور سنسان گلی گونجی۔

"کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟"

کراچی میں کل کے طبقات کی بنیاد رکھی جا رہی ہے جو موجودہ اتھل پتھل میں تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔ اس دھکم پیل میں' اس گھمسان میں جو دردِ زہ کی طرح ایک لاوارث شہر کو جھنجھوڑ رہا ہے' کل کا طبقہ اشرافیہ جنم لے رہا ہے۔ وہ لوگ جو آج داؤ مار لیں گے انہی کے خاندان کل صاحب حیثیت ہوں گے۔ اشرافیہ میں نئے نام اور ذاتیں شامل ہوں گی۔ نیا نکور بالائی طبقہ پیدا ہو گا۔

کراچی میں کوئی نئی بات نہیں ہو رہی' انسانی معاشرے کے طبقات بننے کی کہانی دہرائی جا رہی ہے۔ پرانے اشرافیہ نے جاگیریں اور ملیں اخلاقیات پر مضامین لکھ کر حاصل نہیں کی تھیں۔ یہ کھیل خونریزی کے کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔

کراچی سہما ہوا--- کراچی خون میں نہایا ہوا--- شام کے اخباروں میں مقتولوں کی تصویر--- کرسی سے لڑھکتا ہوا کوئی آدمی--- جیسے مکر کر رہا ہو' اداکاری کرتا ہو مرنے کی' قتل ہونے کی---

بوڑھے نے اسے اپنے سینے سے لگا کر سختی سے بھینچا اور کہا۔ "سنو---"

وہ سن سی لیٹی رہی' چاند کو گھورتی۔ پھر بوڑھے نے کہا۔

انسان میں اور دوسرے جانوروں میں فرق یہ ہے کہ ایک دوسرے کا گوشت بھنبھوڑنے سے پہلے اور بعد میں آدمی واویلا بہت کرتا ہے' ندامت کے آنسو بہاتا ہے۔ آئے ہائے! یہ ہم نے کیا کیا! (اکثر کہتا ہے۔ یہ تم نے کیا کیا!) انسانیت کا خون کر دیا! ننھے ننھے بچوں کو آگ کے شعلوں میں پھینک دیا! (اپنے دہن سے خون پونچھتے ہوئے) عورتوں کے اندام نہانی میں سنگینیں اتار دیں۔ بھوں بھوں--- رونا--- سسکیاں--- جبکہ اس کا آدھا دماغ زمان و مکاں کے کسی بھی منطقے میں ٹھہرائے گئے حریف کو نیچا دکھانے کا تازہ ترین سوچ رہا ہوتا ہے۔ سالے تیری منڈیا نہ جب تک رگڑ دوں خاک میں---

"پھر متعدد قتل کرنے کے بعد چھینی ہوئی اپنے حصے کی روٹی--- یا ایسی روٹی جس پر اس کے خیال میں دراصل اس کا حق تھا--- کھانا اسے اچھا بھی نہیں لگتا۔ یہ ابھی تک خون میں تر ہوتی ہے۔ وہ اسے اگل اگل کر کھائے گا۔ زمین پر لوٹیں لگائے گا۔ درختوں پر جھولا ڈال کر جھولے گا۔ بارش میں نہائے گا پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہے گا۔ آہ! دھنک کس قدر حسین ہوتی ہے! اس پر کچھ شعر لکھے گا---"

"ہم---" عورت نے کہانی سنتے سنتے ہنکار ابھرا اور ایک لمبی، ٹھٹھری سانس لی، اے
دارلسلطنت میں کی گئی اپنے دوست سے گفتگو یاد آئی۔

وہ کرسی میں منجمد بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔ "صرف کراچی ہی کیوں؟ پوری دنیا میں کیا ہ
رہا ہے؟ بوسنیا کو دیکھئے۔ یہ نام نہاد اکیسویں صدی نسلی تنازعات، خونریزی اور تعصب ۔
عبارت ہوگی۔" پھر اس نے کچھ سوچ کر اضافہ کیا۔

"کراچی کے لیے روتی کیوں ہیں بزدلوں کی طرح؟ اس کے بدلے--- ہندوستان ـ
مسلمانوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ کیا وہ بالکل برباد نہیں ہو جائیں گے؟"

"کیا وہ بالکل برباد ہو جائیں گے؟" عورت نے مسحور ہو کر دہرایا۔

"یقیناً!" اس کے دوست نے کہا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔

عورت سوچ میں پڑ گئی۔ آیا اسے بزدلوں کی طرح کراچی پر رونے کے بد۔
(بہادروں کی طرح) ہندوستان کے مسلمانوں پر رونا چاہیے؟ مضبوطی سے نظریں اس طرف
جمائے رکھنی چاہئیں؟ یقیناً یہ زیادہ محفوظ بات تو ہے۔ اس نے کرسی پر دیر سے خاموش بیٹھے
بہت تنہا لگتے اپنے عزیز مارکسی دوست پر نظر ڈال کر سوچا۔ ملکی متحارب لوگوں کے عتاب ۔
اسی طرح بچا جا سکتا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی بھی یہی رضا ہے کہ لکھنے لکھانے والے کراچی ک
گندی بحث میں الجھنے کے بجائے ملک اور مسلمانوں کے خلاف بیرون ملک کی جانے والی نت
نئی سازشوں پر خامہ فرسائی کریں۔

مگر عورت کو تو کراچی واپس آنا تھا اور ایک مادہ بھیڑیئے کی چنگھاڑ سننی تھی۔

لہٰذا اس نے اپنی نظریں اس رات کے پیلے ماہتاب پر گاڑ دیں جہاں رئیس میاں چر
کات رہے تھے۔

"پنجابی--- سندھی--- مہاجر---"

وہ اپنی سانسوں میں بڑبڑائی اور اچانک وہ کسی دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔ غال
1968ء یا 1969ء کی ایک کالی گھپ اماوس کی رات--- ایک ریل گاڑی پوری آواز ـ
رات کی بھیانک تاریکی میں داخل ہوئی اور دھڑ دھڑاتی ہوئی اندھیرے میں سے گزر
لگی۔ اس کے ایک ڈبے میں دو نوجوان لڑکیاں خوف سے لرز رہی ہیں۔ انہیں حیدرآبا
سندھ کے قریب، سندھو ندی کے کنارے بنی بستی جام شورو جانا ہے۔ یہ لڑکیاں کس قوم
قومیت کی ہیں؟ آپ انہیں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں--- ماں مہاجر اور باپ پنجابی۔ یہ یونیورسٹ

میں پڑھتی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں سندھی قوم پرست طلباء تحریک کا زور ہے۔ چند دن پہلے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں سندھی قوم پرستوں نے اشتعال میں آ کر ایک پنجابی آبادکار کے گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ خبر تھی کہ اس گھر کی جوان لڑکی کے ساتھ زنا کر کے اس کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش لٹکا دی گئی تھی۔ اس طرح کہ اس کے پوشیدہ عضو میں ایک کھردری لکڑی ٹھنسی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کے ساتھ اس ڈبے میں اتفاقاً ایک فوجی جوان بھی ہے۔ اس نے لڑکیوں کو بہ حفاظت ان کے گھر تک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔ اندھیرے کو چیرتی جاتی، دھڑدھڑاتی اس ریل گاڑی کی اندرونی روشنی کی لکیر میں ان دو نصف پنجابی نصف مہاجر نوجوان لڑکیوں کے لیے ایک فرشتے سے کم نہ تھا پاک فوج کا جوان، جس نے انہیں بہ حفاظت گھر تک پہنچایا۔

پھر وہ ریل بھی گزر گئی اور کراچی میں ایک دن طلوع ہوا۔ بھٹو حکومت کے خلاف پی این اے کی تحریک کے زمانے کا ایک دن۔ اس دن کی روشنی میں کراچی کے ایک علاقے بہادر آباد میں بھٹو مخالف مقامیوں نے ایک بوڑھے سندھی کو ہلاک کر کے اس کی لاش چوراہے پر لٹکا دی تھی۔ بہت دیر تک وہ لاش جھولتی رہی۔

پھر اس نے انسانی اعضا دیکھے جن پر جلتے سگریٹوں سے جیئے مہاجر یا جیئے سندھ لکھا تھا۔

اسے کراچی کے سندھی مخالف لسانی فسادات یاد آئے۔ سندھ کی اسمبلی میں لسانی بل پاس ہوا تھا اور کراچی میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا لیاقت آباد کے ایک جھوٹے سے مکان کی بالائی منزل پر ایک بڑے میاں باورچی خانے میں گھسے بڑی سی دیگ میں پانی ابال رہے ہیں۔

"ارے اتنے پانی کا کیا کیجئے گا؟" اس نے پیار سے پوچھا۔

بڑے میاں اتنے ضعیف ہیں--- کمر دوہری، تن کا ایک ایک بال سفید--- سفید جھک کرتا پہنے۔

"ارے بھائی یہ پانی---" وہ پوپلے منہ سے بولے، "پھینکیں گے کھولتا ہوا پانی--- کیا نام کہ پولیس پر--- اور یہ" انہوں نے پاس رکھا پسی مرچوں کا بڑا سا ڈبہ دکھایا۔

عورت ہنسنے لگی۔ چاندنی میں اسے اپنی ہنسی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے گھر کی نچلی منزل سے چمپا اور چنبیلی کی مہک تیرتی ہوئی اوپر آنے لگی۔

◆ ◇ ◆ ◇ ◆

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (3)

جب معتوب سیاسی تنظیم کے رکن' سابق بلدیاتی کاؤنسلر کو کراچی کے ایک بھرے پرے محلے سے گرفتار کیا گیا تھا تو یہ متوقع نہ تھا کہ اس کی لاش دوسرے ہی دن ہسپتال پہنچادی جائے گی۔ (کئی مہینوں سے اس عمل میں دو تین دن کا وقفہ پڑنے کا معمول تھا۔) پولیس رپورٹ میں درج تھا کہ متوفی پر حراست میں دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ دل کا دورہ ایک وبا کی طرح گرفتار شدگان میں پھیل چکا تھا اور نوجوان لڑکے حراست میں دل کے دوروں کا شکار ہو رہے تھے۔

پوسٹ مارٹم کے بعد فوراً لاش واپس لے گئی۔ مگر ہسپتال میں موجود عینی شاہدوں اور چند ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ متوفی کے پورے جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ اخباروں میں آنے والی دیگر رپورٹوں میں درج تھا کہ اس کی ایک آنکھ بھی غائب تھی۔

یہ پڑھ کر کراچی میں رہنے والا ایک دردمند شخص سر تھام کر بیٹھ گیا کیونکہ اسے متلی ہونے لگی تھی اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ "آنکھ نکال لی!" یہ الفاظ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ اس کے ذہن میں یہ عجیب سا خیال بھی آیا کہ اس رات جب لوگ اپنے گھروں میں آرام سے سو رہے تھے' ایک شخص کی آنکھ نکالی جا رہی تھی۔ اس خیال سے وہ پوری رات سو نہ سکا۔

دوسرے دن کے اخبار میں پولیس کی جانب سے متوفی پر اذیت کرنے کی تردید شائع ہوئی۔ پولیس نے بیان دیا کہ لاش پر اذیت کے نشان پہلے سے موجود تھے۔ وہ معتوب سیاسی تنظیم کے عقوبت خانے میں خود انہی کے ہاتھوں اذیت کا شکار ہوا تھا۔ اپنے اوپر تشدد کروا

کے وہ گرتا پڑتا لڑکھڑاتا سڑک پر جا رہا تھا کہ گرفتار ہو گیا اور تب حراست میں اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گیا۔

یہ تردید پڑھ کر دردمند شخص کی خاک تسلی نہ ہو سکی۔ بار بار ایک ہی خیال اس کے دل کو کچوکے دیتا رہا کہ جب اس پر اتنا تشدد ہو چکا تھا تو وہ کم بخت عقوبت خانے سے نکلا ہی کیوں اور اس حالت میں پیدل آخر کہاں کے لیے چل پڑا' رکشہ ٹیکسی ہی کر لی ہوتی۔ لہٰذا پھر وہ پوری رات نہ سو سکا اور رات بھر اس کے ذہن میں ایک شخص ہیبت سے منہ پھاڑے' گھٹی گھٹی آواز میں کربناک چیخوں کے ٹکڑے حلق سے نکالتا رہا۔ ایک نشتر اس کی آنکھ کا ڈھیلا نکالتا رہا اور وہ آنکھ نکلنے کے ساتھ کرسی سے ٹیڑھا ہو کر اوپر اٹھتا چلا گیا۔

برحال' تیسرے دن کے اخباروں میں آیا کہ لاش پہلے ایک رفاہی ادارے کے حوالے کی گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب لاش ان کے پاس لائی گئی تو اس پر تشدد کے نشان تھے اور آنکھ میں گولی ماری گئی تھی جو کھوپڑی کی پشت سے پار ہو گئی تھی۔

یہ پڑھ کر دردمند شخص پر سکون ہوا۔ اس نے سوچا کہ لاحول ولا قوۃ! میں تو سمجھا تھا کہ آنکھ نکالی گئی ہے۔ اب پتا چلا کہ اس میں تو گولی ماری گئی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اس رات وہ آرام سے سویا۔

♦ ◇ ♦ ◇ ♦

جس سہ پہر آمنہ بیگم کے گھر ٹیلی فون آیا تھا کہ ان کی بہن کو فیڈرل بی ایریا کے کسی ہسپتال میں داخل کیا گیا ہے' ان کا دل ڈوبنے لگا۔ فون پر بمشکل ہسپتال کا پتہ لے کر انہوں نے بٹوہ سنبھالا اور گھبرائی ہوئی پڑوسن کے گھر جا پہنچیں۔ دستک دی تو عمران نے دروازہ کھولا۔ وہ انہیں ہسپتال لے جانے کو تیار ہو گیا۔ دسراہت کی خاطر اس کی ماں بھی آمنہ بیگم کے ساتھ ہو لیں۔

آمنہ بیگم کا پڑوسی' چوبیس پچیس سالہ جوان انہیں گھر کی کار میں ہسپتال لے چلا۔ اس نے پہلا ہی موڑ کاٹا ہو گا کہ سپاہیوں کا ایک ٹرک سامنے آ گیا۔ عمران نے ایکسیلیٹر سے پیر ہٹا کر ویل کو تیزی سے بائیں جانب گھمایا۔ پہیوں کی چیخ کے ساتھ گاڑی لہرائی اور سڑک کے وسط میں آ گئی۔ مگر عمران زیادہ دور نہ جا سکا۔ سپاہیوں کے ٹرک نے تیزی سے پلٹ کر اس کا راستہ روک دیا۔

پھر انہوں نے عمران کو گاڑی سے کھینچ کر باہر نکالا اور غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ اسے بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ "خنزیر کے تخم! اگر ٹکرا جاتی تو؟"

پچھلی سیٹ پر بیٹھی دونوں عورتوں کی ہائیں ہائیں اور چیخ و پکار چند لمحوں کے بعد ختم ہو گئی۔ وہ خاموش بیٹھی تھر تھر کانپتی رہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے بہتے' ان کی ناک اور ٹھوڑی اور تھر تھراتے ہونٹوں سے نیچے ٹپکتے رہے۔

سڑک پر خوانچے والا بیٹھا تھا۔ عمران کو بری طرح مار کھاتا دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا اور خوانچے کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ تھپڑ کی اور ٹھوکر کی ہر آواز کے ساتھ اس کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی گئی اور ہاتھوں کی موٹی' بوڑھی رگیں ابھرتی گئیں۔

پاس سے گزرنے والی کسی شہری کی کار نے لمحہ بھر کو رفتار دھیمی کی' پھر تیزی سے گلی سے چلی گئی۔

مار کھانے کے بعد عمران گاڑی میں بیٹھا۔ ہوش حواس مجتمع کر کے وہ گلی سے باہر نکلا۔ بڑی سڑک پر آ کر اس نے محلے کی کریانے کی دکان کے سامنے گاڑی روکی۔ دکان دار اسے پہچان کر اس کی طرف بڑھا۔ "ارے' تمہاری یہ حالت!" واقعے کی نوعیت اسے سمجھائی گئی۔ دکاندار کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ خاموشی سے اندر جا کر پانی کا گلاس لایا۔ عمران نے ہاتھ کی آڑ لے کر دانتوں سے نکلنے والے خون کی کلی کی اور ٹشو پیپر سے منہ صاف کیا۔ بال ٹھیک کر کے تھوڑی دیر بعد وہ ماں اور پڑوس کی منہ بولی خالہ کو لے کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔

پھر عمران بھی کہیں چلا گیا۔ کہاں؟ کون جانے!

♦ ◇ ♦ ◇ ♦